جاوید احمد غامدی

حج و عمرہ

یہ دونوں عبادات دین ابراہیمی میں عبادت کا منتہاے کمال ہیں۔ اِن کی تاریخ اُس منادی سے شروع ہوتی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی تعمیر کے بعد کی تھی کہ لوگ خداوند کی نذر چڑھانے کے لیے آئیں اور توحید پر ایمان کا جو عہد اُنھوں نے باندھ رکھا ہے، اُسے یہاں آکر تازہ کریں۔

اپنے معبود کے لیے جذبۂ پرستش کا یہ آخری درجہ ہے کہ اُس کے طلب کرنے پر بندہ اپنا جان و مال، سب اُس کے حضور میں نذر کر دینے کے لیے حاضر ہو جائے۔ حج و عمرہ اِسی نذر کی تمثیل ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کو ممثل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ اجمال ہے اور حج اِس لحاظ سے اُس کی تفصیل کر دیتا ہے کہ اِس سے وہ مقصد بھی بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے جس کے لیے جان و مال نذر کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آدم کی تخلیق سے اُس کی جو اسکیم دنیا میں برپا ہوئی ہے، ابلیس نے پہلے دن ہی سے اُس کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ کے بندے اب قیامت تک کے لیے اپنے اِس ازلی دشمن اور اِس کی ذریت کے خلاف برسر جنگ ہیں۔ یہی اِس دنیا کی آزمایش ہے جس میں کامیابی اور ناکامی پر انسان کے ابدی مستقبل کا انحصار ہے۔ اپنا جان و مال ہم اِسی جنگ کے لیے اللہ کی نذر کرتے ہیں۔ ابلیس کے خلاف اِس جنگ کو حج میں ممثل کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل اِس طرح ہے:

اللہ کے بندے اپنے پروردگار کی ندا پر دنیا کے مال و متاع اور اُس کی لذتوں اور مصروفیتوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

پھر 'لَبَّیکَ لَبَّیکَ' کہتے ہوئے میدان جنگ میں پہنچتے اور بالکل مجاہدین کے طریقے پر ایک وادی میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اگلے دن ایک کھلے میدان میں پہنچ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے اور اپنے امام کا خطبہ سنتے ہیں۔

تمثیل کے تقاضے سے نمازیں قصر اور جمع کر کے پڑھتے اور راستے میں مختصر پڑاؤ کرتے ہوئے دوبارہ اپنے ڈیروں پر پہنچ جاتے ہیں۔

پھر شیطان پر سنگ باری کرتے، اپنے جانوروں کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو خداوند کی نذر کرتے، سر منڈاتے اور نذر کے پھیروں کے لیے اصل معبد اور قربان گاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

پھر وہاں سے لوٹتے اور اگلے دو یا تین دن اِسی طرح شیطان پر سنگ باری کرتے رہتے ہیں۔

اِس لحاظ سے دیکھیے تو حج و عمرہ میں احرام اِس بات کی علامت ہے کہ بندۂ مومن نے دنیا کی لذتوں، مصروفیتوں اور مرغوبات سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور دو اَن سلی چادروں سے اپنا بدن ڈھانپ کر وہ برہنہ سر اور کسی حد تک برہنہ پا بالکل راہبوں کی صورت بنائے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہے۔

تلبیہ اُس صدا کا جواب ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت الحرام کی تعمیر نو کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر بلند کی تھی۔ اب یہ صدا دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے اور اللہ کے بندے اُس کی نعمتوں کا اعتراف اور اُس کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے اِس صدا کے جواب میں 'لَبَّیکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیکَ' کا یہ دل نواز ترانہ پڑھتے ہیں۔

طواف نذر کے پھیرے ہیں۔ دین ابراہیمی میں یہ روایت قدیم سے چلی آ رہی ہے کہ جس کی قربانی کی جائے یا جس کو معبد کی خدمت کے لیے نذر کیا جائے، اُسے معبد یا قربان گاہ کے سامنے پھرایا جائے۔

حجر اسود کا استلام تجدید عہد کی علامت ہے۔ اِس میں بندہ اِس پتھر کو تمثیلاً اپنے پروردگار کا ہاتھ قرار دے کر اِس ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا اور عہد و میثاق کی قدیم روایت کے مطابق اِس کو چوم کر اپنے اِس عہد کی تجدید کرتا ہے کہ اسلام قبول کر کے وہ جنت کے عوض اپنا جان و مال، سب اللہ کے سپرد کر چکا ہے۔

سعی اسمٰعیل علیہ السلام کی قربان گاہ کا طواف ہے۔ سیدنا ابراہیم نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اِس قربان گاہ کو دیکھا تھا اور پھر حکم کی تعمیل کے لیے ذرا تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے مروہ کی طرف گئے تھے۔ چنانچہ صفا و مروہ کا یہ طواف

بھی نذر کے پھیرے ہیں جو پہلے معبد کے سامنے اور اِس کے بعد قربانی کی جگہ پر لگائے جاتے ہیں۔

عرفات معبد کا قائم مقام ہے، جہاں شیطان کے خلاف اِس جنگ کے مجاہدین جمع ہوتے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے ہیں۔

مزدلفہ راستے کا پڑاؤ ہے، جہاں وہ رات گزارتے اور صبح اُٹھ کر میدان میں اترنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دعا و مناجات کرتے ہیں۔

رمی ابلیس پر لعنت اور اُس کے خلاف جنگ کی علامت ہے۔ یہ عمل اِس عزم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بندۂ مومن ابلیس کی پسپائی سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگا۔ یہ معلوم ہے کہ انسان کا یہ ازلی دشمن جب وسوسہ انگیزی کرتا ہے تو اِس کے بعد خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ تاہم مزاحمت کی جائے تو اِس کی تاخت بتدریج کمزور ہو جاتی ہے۔ تین دن کی رمی اور اِس کے لیے پہلے بڑے اور اِس کے بعد چھوٹے جمرات کی رمی سے اِسی بات کو ظاہر کیا گیا ہے۔

قربانی جان کا فدیہ ہے اور سر کے بال مونڈنا اِس بات کی علامت ہے کہ نذر پیش کر دی گئی اور اب بندہ اپنے خداوند کی اطاعت اور دائمی غلامی کی اِس علامت کے ساتھ اپنے گھر لوٹ سکتا ہے۔

اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر غیر معمولی عبادت ہے جو ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ فرض کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانفال

(۷)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ

یہ منکرین اِس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ نکل بھاگیں گے، یہ ہرگز ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے[100]۔ تم سے جس قدر ہو سکے اِن کے لیے فوج[101] اور بندھے ہوئے گھوڑے[102] تیار رکھو جس سے اللہ کے دشمنوں پر

۱۰۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ'۔ یہ اُسی مفہوم میں ہے جس میں 'اعجزه الصيد' کا جملہ بولا جاتا ہے، یعنی 'فاته ولم يقدر عليه'۔

۱۰۱؎ اصل میں لفظ قوت آیا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عددی قوت کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے پاس مجاہدین کی ایک منظّم فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت اِن منکرین حق کے خلاف کارروائی کی جا سکے۔ یہ نہ ہو کہ جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آئے تو رضاکاروں کو اکٹھا کرنا شروع کر دو۔ اپنی استطاعت کے مطابق یہ فوجی قوت اب تمھیں تیار رکھنی چاہیے اور زیادہ سے زیادہ بڑھا لینی چاہیے۔

۱۰۲؎ یعنی وہ گھوڑے جنھیں تربیت دے کر خاص اِسی مقصد کے لیے تیار رکھا گیا ہو۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اُس

مِنۡ دُوۡنِہِمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَہُمۡ اَللّٰہُ یَعۡلَمُہُمۡ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ
یُوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۰﴾
وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَہَا وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۱﴾

اور تمھارے اِن دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور اِن کے علاوہ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ اُنھیں جانتا ہے[۱۰۳]۔ (اِس مقصد کے لیے) جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، وہ تمھیں پورا کر دیا جائے گا[۱۰۴] اور تمھارے لیے کوئی کمی نہ ہو گی۔ ۵۹-۶۰

یہ لوگ اگر صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اِس کے لیے جھک جاؤ[۱۰۵] اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ بے شک، وہ

زمانے کی جنگ میں گھوڑوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اِس زمانے میں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کو حاصل ہے۔

۱۰۳؎ یہ اُن قوتوں کی طرف اشارہ ہے جو ابھی سامنے نہیں آئی تھیں، لیکن اللہ کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر کسی نہ کسی صورت میں سامنے آ جائیں گی۔ مثلاً یہود اور منافقین، نیز وہ قبائل جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر جانب داری کے معاہدے کر رکھے تھے، پھر رومی، غسانی اور ایرانی۔ یہ بھی متنبہ ہو چکے تھے اور سرزمین عرب میں جو کچھ ہو رہا تھا، اُسے تشویش کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

۱۰۴؎ یعنی اُسی اصول کے مطابق پورا کر دیا جائے گا جو نیکیوں کے اجر کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے۔

۱۰۵؎ سورۂ توبہ میں منکرین حق کے استیصال کا آخری حکم آنے سے پہلے یہی ہدایت تھی کہ قریش اگر جنگ کرنا چاہیں تو اُن کے ساتھ جنگ اُس وقت تک جاری رکھی جائے، جب تک سرزمین عرب میں دین سب اللہ کے لیے نہ ہو جائے، لیکن وہ صلح کے خواہاں ہوں تو اُن سے صلح کر لی جائے تاکہ یہی مقصد امن کے ماحول میں اور دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ اِسی ہدایت کے تحت کیا گیا تھا۔ قریش جب اِس معاہدے پر قائم نہیں رہے تو اِس کے بعد، البتہ حکم دے دیا گیا کہ اب اِن سے ایمان کے سوا کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ ہدایات اگرچہ خاص اُن لوگوں کے لیے تھیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا تھا، لیکن اِن سے یہ رہنمائی بعد کے زمانوں کے لیے بھی یقیناً حاصل ہوتی ہے کہ جنگ کا مقصد اگر صلح سے حاصل ہو سکتا ہو تو صلح کو ترجیح دینی چاہیے اور محض اِس اندیشے سے صلح کی پیش کش ٹھکرانی نہیں چاہیے کہ دشمن نیک نیتی سے صلح نہیں

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَالَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾
وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْاَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ
اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

سننے والا، جاننے والا ہے۔ (تم مطمئن رہو)، اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمھارے لیے کافی ہے[۱۰۶]۔ وہی ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ اگر تم زمین میں جو کچھ ہے، سب خرچ کر ڈالتے، تب بھی اُن کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، مگر اللہ نے اُنھیں جوڑ دیا[۱۰۷]۔ یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ۶۱-۶۳

کرنا چاہتا، بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔

۱۰۶؎ اِس اجمال میں جو کچھ مضمر ہے، قلم اُس کی تعبیر سے قاصر ہے۔

۱۰۷؎ اوپر فرمایا ہے کہ اللہ نے مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔ یہ اُس کی وضاحت ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، بلکہ خاص تائید الٰہی کا کرشمہ تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا، ہر نعرہ باز یہ کام کر سکتا ہے، لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی طلب کے سوا کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو، کلمۂ حق کے جاں نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا بغیر اِس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اُس کی توفیق بخشی نے رہنمائی فرمائی۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے، اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے، دور جاہلیت کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے، اُن کے قبیلے جدا جدا تھے اور اُن میں شدید قسم کے تعصّبات تھے، اُن کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے مفادات باہم متصادم تھے اور یہ اُن کے حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے۔ اِس طرح کے لوگوں کو اُن کے تمام تعصّبات و مفادات اور تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھال دینا اور اُس سانچے کو اُن کی نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اُس کی خاطر وہ قوم، وطن، خاندان، جائداد اور بیوی بچے، سب کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں، یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے۔ کوئی انسان یہ کام نہیں انجام دے سکتا، اگرچہ وہ دنیا جہان کے سارے وسائل اُس پر صرف کر ڈالے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۰۵)

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ ﴿۶۵﴾

اے پیغمبر، تمھارے لیے اللہ کافی ہے اور یہی مومنین کافی ہیں جنھوں نے تمھاری پیروی اختیار کر لی ہے۔[۱۰۸] اے پیغمبر، اِن مومنوں کو (اُس) جنگ پر ابھارو (جس کا حکم پیچھے دیا گیا ہے)۔ اگر تمھارے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے سو ہوں گے تو ہزار منکروں پر بھاری رہیں گے، اِس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو بصیرت نہیں رکھتے۔[۱۰۹] ۶۴-۶۵

۱۰۸؎ یعنی مدد کے لیے اللہ اور رفاقت کے لیے یہی تھوڑے سے مسلمان کافی ہیں، لہٰذا منکرین حق کی کثرت اور اپنے ساتھیوں کی قلت کی فکر نہ کرو۔ یہ گویا وہی بات دوسرے اسلوب میں فرمائی ہے جو اوپر 'فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰہُ، ھُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ' کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

۱۰۹؎ یہ اُس جہاد کے لیے ذمہ داری کی حد بیان کی ہے جس کا حکم پیچھے 'حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ' کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ یہاں اُسی کے لیے ابھارنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمانوں کی جماعت چونکہ اُس وقت زیادہ تر مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی اور ایمان و اخلاق کے اعتبار سے اُس میں کسی نوعیت کا کوئی ضعف نہ تھا، اِس لیے وہ پابند کیے گئے کہ دس کے مقابلے میں ایک بھی ہوں تو اِس ذمہ داری کو پورا کریں۔ ایمان و اخلاق کی قوت کو یہاں 'فِقْہ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...'فقہ' سے مراد بصیرت ایمانی ہے۔ یہی بصیرت انسان کا اصل جوہر ہے۔ اِس بصیرت کے ساتھ جب مومن میدان جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے تنہا وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے، اُس کو اپنے دہنے بائیں خدا کی نصرت نظر آتی ہے، موت اُس کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب ہو جاتی ہے، اِس لیے کہ اُس کی بصیرت اُس کے سامنے اُس منزل کو روشن کر کے دکھا دیتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اُس کے اندر وہ صبر و ثبات پیدا کرتی ہے جو اُس کو تنہا اِس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر بھاری کر دیتی ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۵۰۶)

اَلْـئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴿٦٦﴾

اِس وقت، البتہ اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، (اِس لیے کہ) اُس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ سو تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے۔ اور اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو (اُس کی راہ میں) ثابت قدم رہیں[۱۱۰]۔ ۶۶

۱۱۰؎ یعنی اصل حکم تو وہی ہے، لیکن اِس وقت بہت سے نئے لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت بڑھ گئی ہے، مگر دین کی بصیرت کے لحاظ سے وہ سابقین اولین کے ہم پایہ نہیں رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، اب اُن کے سو پابند ہوں گے کہ اللہ کے حکم پر دو سو کے مقابلے میں جنگ کریں۔

سورۂ انفال کی یہ آیتیں، اگر غور کیجیے تو جہاد و قتال کی ذمہ داری کے ساتھ اُس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا ضابطہ بھی بالکل متعین کر دیتی ہیں۔ اِن میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جنگ میں نصرت الٰہی کا معاملہ الل ٹپ نہیں ہے کہ جس طرح لوگوں کی خواہش ہو، اللہ کی مدد بھی اُسی طرح آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے اور وہ اِسی کے مطابق اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرت الٰہی کا یہ ضابطہ درج ذیل تین نکات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ اللہ کی مدد کے لیے سب سے بنیادی چیز صبر و ثبات ہے۔ مسلمانوں کی کسی جماعت کو اِس کا استحقاق اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک وہ یہ صفت اپنے اندر پیدا نہ کر لے۔ اِس سے محروم کوئی جماعت اگر میدان جہاد میں اترتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے کسی مدد کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ 'صٰبِرُوْنَ' اور 'صَابِرَةٌ' کی صفات سے اِن آیتوں میں یہی بات واضح کی گئی ہے۔ 'وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ' کے الفاظ بھی آیات کے آخر میں اِسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔

دوم یہ کہ جنگ میں اترنے کے لیے مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ اِس میں تو شبہ نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور آدمی کا اصل بھروسا اللہ پروردگار عالم ہی پر ہونا چاہیے، لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عالم اسباب کے طور پر بنائی ہے۔ دنیا کی یہ اسکیم تقاضا کرتی ہے کہ نیکی اور خیر کے لیے بھی کوئی اقدام اگر پیش نظر ہے تو اُس کے لیے ضروری وسائل ہر حال میں فراہم کیے جائیں۔ یہ اسباب و وسائل کیا ہونے چاہییں؟ دشمن کی قوت سے اِن کی ایک نسبت اللہ تعالیٰ نے انفال کی اِن آیتوں میں قائم کر دی ہے۔ یہ اگر حاصل نہ ہوتو مسلمانوں کو اِس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ جہاد کے شوق میں یا جذبات سے مغلوب ہو کر اِس سے پہلے اگر وہ کوئی اقدام کرتے ہیں تو اُس کی ذمہ داری اُنھی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس صورت میں اُن کے لیے کسی مدد کا ہرگز کوئی وعدہ نہیں ہے۔

سوم یہ کہ مادی قوت کی کمی کو جو چیز پورا کرتی ہے، وہ ایمان کی قوت ہے۔ 'عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا' اور 'بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ' میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ 'ضَعْف' کا لفظ عربی زبان میں صرف جسمانی اور مادی کمزوری کے لیے نہیں آتا، بلکہ ایمان و حوصلہ اور بصیرت و معرفت کی کمزوری کے لیے بھی آتا ہے۔ اِسی طرح 'لَا يَفْقَهُوْنَ' کے معنی بھی یہاں اِس کے مقابلے میں ایمانی بصیرت سے محرومی ہی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ منکرین حق چونکہ اِس بصیرت سے محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں اِس معرفت سے خوب خوب نوازا ہے، اِس لیے تم اگر ہزار کے مقابلے میں سو بھی ہو گے تو اللہ کی نصرت سے تمھیں اُن پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ تاہم اِس بصیرت میں کمی ہوئی تو یہ نسبت بھی اِس کے ساتھ ہی تبدیل ہو جائے گی۔

نصرت الٰہی کا یہ ضابطہ قدسیوں کی اُس جماعت کے لیے بیان ہوا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اور براہ راست اللہ کے حکم سے میدان جہاد میں اتری۔ بعد کے زمانوں میں، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی ایمانی حالت کے پیش نظر یہ نسبت کس حد تک کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

قانون عبادات

نماز کی اہمیت

۱۔عن عبد اللّٰہِ قال سَأَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَیُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إلی اللّٰہِ قال الصَّلَاۃُ علی وَقْتِہَا قال ثُمَّ أَیٌّ قال ثُمَّ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ قال ثُمَّ أَیٌّ قال الْجِہَادُ فی سَبِیلِ اللّٰہ. (بخاری، رقم ۵۲۷)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے وقت پر نماز پڑھنا، پھر پوچھا، اس کے بعد، فرمایا والدین کے ساتھ نیک معاملہ رکھنا، پوچھا اس کے بعد، آپ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''

۲۔عن نَافِعٍ مولی عَبْد اللّٰہ بن عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ بن الْخَطَّابِ کَتَبَ إلی عُمَّالِہِ إِنَّ أَہَمَّ أَمْرِکُمْ عِنْدِی الصَّلَاۃُ فَمَنْ حَفِظَہَا وَحَافَظَ علیہا حَفِظَ دِینَہُ وَمَنْ ضَیَّعَہَا فَہُوَ لِمَا سِوَاہَا أَضْیَعُ. (موطا، رقم ۶)

نافع مولیٰ ابن عمر سے روایت ہے کہ: ''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کے نام ایک خط میں

لکھا: تمھارے دینی معاملات میں میرے نزدیک سب سے اہم چیز نماز ہے۔ جو اپنی نماز کی حفاظت اور پابندی کرے گا، وہ پورے دین کی حفاظت کرے گا، اور جو اِسے ضائع کر دے گا، وہ باقی دین کو سب سے بڑھ کر ضائع کرنے والا ہو گا۔''

۳۔ عَنْ جَابِرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ يقول سمعتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول بين الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ. (مسلم، رقم ۲۴۷)

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آدمی اور اُس کے کفر و شرک کے درمیان نماز چھوڑنے کا فرق ہے۔''

۴۔ عَنْ عُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِ أَشْهَدُ أَنِّى سمعت رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللّٰه تَعَالَى مَنْ أَحْسَنَ وُضُوءَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَأَتَمَّ رُكُوعَهُنَّ وَخُشُوعَهُنَّ كان له على اللّٰهِ عَهْدٌ أَنْ يَغْفِرَ له وَمَنْ لم يَفْعَلْ فَلَيْسَ له على اللّٰهِ عَهْدٌ إن شَاءَ غَفَرَ له وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ. (ابوداؤد، رقم ۴۲۵)

عبادہ بن ثابت سے روایت ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: یہ ''پانچ نمازیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فرض کیا ہے، جس نے اِن کے لیے اچھے طریقے سے وضو کیا، اِنھیں وقت پر ادا کیا اور اپنا ظاہر و باطن اِن میں پوری طرح اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دیا، اُس کے لیے اللہ کا عہد ہے کہ اُسے بخش دے گا اور جس نے یہ نہیں کیا، اُس کے لیے اللہ کا کوئی عہد نہیں۔ وہ چاہے تو اُسے بخش دے اور چاہے تو عذاب دے۔''

۵۔عن أبی هُرَيْرَةَ أَنَّهُ سمع رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول أَرَأَيْتُمْ لو أَنَّ نَهَرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فيه كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا ما تَقُولُ ذلك يُبْقِي مِن دَرَنِهِ قالوا لَا يُبْقِي من دَرَنِهِ شيئا قال فَذَلِكَ مِثْلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللّٰه بها الْخَطَايَا. (بخاری، رقم ۵۲۸)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ بتاؤ کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اُس کے جسم پر میل نام کی کوئی چیز باقی رہ جائے گی؟ لوگوں نے عرض کیا: اِس صورت میں تو یقیناً ذرا میل بھی باقی نہ رہے گی۔ آپ نے فرمایا: یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے۔ اللہ اِن کے ذریعے سے گناہوں کو (بالکل اِسی طرح) مٹا دیتا ہے۔''

توضیح

۱۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ محبوب عمل نماز ہے۔

۲۔اپنی نماز کی حفاظت اور پابندی کرنے والے ہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ پورے دین کی حفاظت کرے گا، دوسرے سے نہیں۔

۳۔اللہ وحدہ لاشریک کے لیے نماز کا اہتمام ہی نہ کرنا، ایمان اور کفر و شرک کے درمیان فاصلے کو ختم کر دیتا ہے۔

۴۔نماز پنج گانہ بخشش کی ضمانت ہے۔

۵۔اللہ تعالیٰ نمازوں کے ذریعے سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

تہجد کی نماز کی خصوصی اہمیت

۶۔عن أبی هُرَيْرَةَ رضی اللّٰه عنه أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قال يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالَى كُلَّ لَيْلَةٍ إلى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حين يَبْقَى ثُلُثُ

اللَّيلِ الآخِرُ يقول من يَدعُونِی فَأَستَجِيبَ له من يَسأَلُنِی فَأُعطِيَهُ من يَستَغفِرُنِی فَأَغفِرَ له. (بخاری، رقم ۱۱۴۵)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارا بلند اور با برکت پروردگار ہر رات کو اُس وقت آسمان دنیا پر آتا ہے جب رات کا آخری تہائی حصہ رہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی مجھ سے دعا کرنے والا ہے کہ میں اُس کی دعا قبول کروں، کوئی مجھ سے مانگنے والا ہے کہ میں اُسے دوں کوئی مجھ سے بخشش طلب کرنے والا ہے کہ میں اُس کو بخش دوں۔''

۷۔قال يَنزِلُ اللّٰه إلی السَّمَاءِ الدُّنيَا كُلَّ لَيلَةٍ حين يَمضِی ثُلُثُ اللَّيلِ الأَوَّلُ فيقول أنا المَلِكُ أنا المَلِكُ من ذَا الذی يَدعُونِی فَأَستَجِيبَ له من ذَا الذی يَسأَلُنِی فَأُعطِيَهُ من ذَا الذی يَستَغفِرُنِی فَأَغفِرَ له فلا يَزَالُ كَذَلِكَ حتی يُضِیءَ الفَجرُ عن أبی هُرَيرَةَ عن رسول اللّٰهِ. (مسلم، رقم ۱۷۷۳)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات کا ابتدائی حصہ گزرنے کے بعد آسمان دنیا کی طرف نزول کرتا اور ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں، میں بادشاہ ہوں، کون ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اُس کی دعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اُسے عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت مانگے اور میں اُسے معاف کر دوں، اللہ تعالیٰ اسی طرح فرماتا رہتا ہے یہاں تک کہ صبح روشن ہو جاتی ہے۔''

توضیح

۱۔خدا شہنشاہ کائنات ہے اُس کی خوبی اور اچھائی ناقابل بیان ہے۔ وہ تہجد کے وقت میں وہ خود آگے بڑھ کر اپنے عابد بندوں کی دعائیں قبول کرتا، اُنھیں اپنی عطاؤں سے نوازتا اور اپنی بخششوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔

صاحب ایمان کے لیے نماز کی حیثیت

۸۔عن عبد اللّٰهِ بن مُحَمَّدِ بن الْحَنَفِيَّةِ قال انْطَلَقْتُ أنا وَأَبِى إلى صِهْرٍ لنا من الْأَنْصَارِ نَعُودُهُ فَحَضَرَتُ الصَّلَاةُ فقال لِبَعْضِ أَهْلِهِ يا جَارِيَةُ ائْتُونِى بِوَضُوءٍ لَعَلِّى أُصَلِّى فَأَسْتَرِيحَ قال فَأَنْكَرْنَا ذلك عليه فقال سمعت رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول قُمْ يا بِلَالُ فَأَرِحْنَا بِالصَّلَاةِ. (ابوداوٗد، رقم ۴۹۸۶)

عبداللہ بن محمد بن حنفیہ سے روایت ہے کہ: ''میں اور میرے والد اپنے ایک انصاری سسرالی رشتہ دار کی عیادت کو گئے تو وہاں نماز کا وقت آ گیا، صاحب خانہ نے اپنے گھر کے کسی فرد یا اپنی لونڈی سے کہا کہ اے لڑکی میرے لیے وضو کا پانی لاؤ تا کہ میں نماز پڑھ لوں اور آرام پاؤں، ہمیں اُن کی یہ بات ناگوار محسوس ہوئی، تو اُنھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اے بلال اٹھو اور ہمیں نماز سے راحت پہنچاؤ۔''

۹۔عن أَنَسٍ قال قال رسول اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ إلى النِّسَاءُ وَالطِّيبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِى فى الصَّلَاةِ. (نسائی، رقم ۳۳۹۲)

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے عورتوں اور خوشبو کی محبت دی گئی ہے اور نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے۔''

توضیح

۱۔ خدا سے سچا تعلق رکھنے والوں کے لیے نماز باعث راحت وسکون ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو جب قوت ایمانی غیب کے پردوں کو اٹھا دیتی ہے تو پھر کیا خدا کے حضور میں قیام اور رکوع وسجود کی سرگوشیوں سے بڑھ کر بھی کوئی آنکھ کی

ٹھنڈک اور دل کی راحت ہو سکتی ہے۔

آداب نماز

۱۰۔عن بن عُمَرَ قال قال رسول اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ ... إذا کان لِأَحَدِکُمۡ ثَوۡبَانِ فَلۡیُصَلِّ فِیۡہِمَا فَإِنۡ لم یَکُنۡ إلا ثَوۡبٌ وَاحِدٌ فَلۡیَتَّزِرۡ بِہٖ ولا یَشۡتَمِلُ اشۡتِمَالَ الۡیَہُوۡدِ. (ابوداؤد، رقم ۶۳۵)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کے پاس دو کپڑے ہوں تو دونوں میں نماز پڑھے اور اگر ایک ہی ہو تو تہ بند باندھ لے، اُسے نماز میں یہودیوں کی طرح چادر بنا کر لپیٹے نہیں۔''

توضیح

۱۔ آدمی کو تن ڈھانپنے کے لیے جتنا کپڑا بھی میسر ہے، اُسے وہ انتہائی باحیا طریقے سے اوڑھے۔ چنانچہ ایک ہی چادر میسر ہو تو اُس سے تہ بند باندھ لے۔ یہ درست نہیں ہے کہ اِس صورت میں وہ اپنے اوپر کے حصے کو ڈھانپتا پھرے۔

نماز ـــــ دین ابراہیمی کی روایت

۱۱۔عَنۡ عبد اللّٰہ بن صامت قال قال أَبُو ذَرٍّ... وَقَدۡ صَلَّیۡتُ یَا بۡنَ أَخِی قَبۡلَ اَنۡ أَلۡقَی رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ بِثَلَاثِ سِنِیۡنَ قلت لِمَنۡ قال لِلّٰہِ قلت فَأَیۡنَ تَوَجَّہُ قال أَتَوَجَّہُ حَیۡثُ یُوَجِّہُنِی رَبِّی. (مسلم، رقم ۶۳۵۹)

عبداللہ بن صامت سے روایت ہے کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ اے میرے بھتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے تین سال پہلے سے ہی نماز پڑھتا تھا۔ میں نے

پوچھا کہ آپ کس کے لیے پڑھتے تھے؟ فرمایا: اللہ کے لیے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کس طرف رخ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادھر جدھر میرا رب میرا رخ کر دیتا تھا۔

توضیح

یہ حدیث بتاتی ہے کہ بعثت نبوی کے موقع پر دین ابراہیمی کی باقیات بہت واضح صورت میں موجود تھیں۔

ابراہیمی روایت کی تجدید واصلاح

۱۲۔عن بن عَبَّاسٍ قال رسول اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَّنِي جِبْرِيلُ عليه السَّلَام عِنْدَ الْبَيْتِ مَرَّتَيْنِ فَصَلَّى بِيَ الظُّهْرَ حين زَالَتْ الشَّمْسُ وَكَانَتْ قَدْرَ الشِّرَاكِ وَصَلَّى بِيَ الْعَصْرَ حين كان ظِلُّهُ مثله وَصَلَّى بِيَ يَعْنِي الْمَغْرِبَ حين أَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلَّى بِيَ الْعِشَاءَ حين غَابَ الشَّفَقُ وَصَلَّى بِيَ الْفَجْرَ حين حَرُمَ الطَّعَامُ وَالشَّرَابُ على الصَّائِمِ فلما كان الْغَدُ صلى بِيَ الظُّهْرَ حين كان ظِلُّهُ مثله وَصَلَّى بِي الْعَصْرَ حين كان ظِلُّهُ مِثْلَيْهِ وَصَلَّى بِيَ الْمَغْرِبَ حين أَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلَّى بِيَ الْعِشَاءَ إلى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَصَلَّى بِيَ الْفَجْرَ فَأَسْفَرَ ثُمَّ الْتَفَتَ إلي فقال يا محمد هذا وَقْتُ لأنبياء من قَبْلِكَ وَالْوَقْتُ ما بين هَذَيْنِ الْوَقْتَيْنِ.

(ابوداود، رقم ۳۹۳)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبرائیل علیہ السلام نے دو مرتبہ خانہ کعبہ کے پاس میری امامت کی ہے، چنانچہ ایک دن تو اُنھوں نے ایسے وقت میں مجھے ظہر کی نماز پڑھائی جب سورج (بس) ڈھلا ہی تھا اور ہر چیز کا سایہ جوتے کے تسمہ کے برابر ہو گیا اور

عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا اور مغرب کی نماز ایسے وقت میں پڑھائی جب روزہ دار روزہ کھولتا ہے اور عشاء کی نماز ایسے وقت میں پڑھائی جب شفق غائب ہو گئی اور فجر کی نماز اُس وقت میں پڑھائی جب روزہ دار کے لیے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے پھر دوسرے دن ظہر کی نماز پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا اور عصر کی نماز پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس سے دوگنا ہو گیا اور مغرب کی نماز پڑھائی جب روزہ دار روزہ کھولتا ہے اور عشاء کی نماز تہائی رات پر پڑھائی اور فجر کی نماز روشنی پھیلنے پر پڑھائی۔ اِس کے بعد جبرائیل علیہ السلام نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے محمد! یہ ہیں تم سے پہلے انبیاء کی نمازوں کے اوقات (اور تمھارے لیے بھی) نماز کے اوقات، وقت کی اِنھی دو حدوں کے درمیان ہیں۔

توضیح

ا۔ اس حدیث سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کی موجود ملت ابراہیمی کی روایت کی تجدید و اصلاح کس طریقے سے فرمائی تھی۔

محمد بلال

نیکیوں کا اہتمام

محمد اسحاق ناگی مرحوم، جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے دل اداس ہو جاتا ہے، دین کے عظیم اور سرگرم کارکن داعی تھے۔ انھوں نے جب پہلی مرتبہ جناب جاوید احمد غامدی کا درس قرآن سنا تو اس کا اپنے موروثی اور ایک معاصر صاحب علم کے طرز فکر سے تقابل کیا، غامدی صاحب کے فہم دین کو بہتر پایا اور ان کے رفیق بن گئے۔ پھر آخری سانس تک یہ رفاقت نبھاتے رہے اور اسی کیفیت میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

جب سے ناگی صاحب کینسر میں مبتلا ہوئے، اس وقت سے غامدی صاحب بیرون ملک میں رہ کر بھی ان کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ انھوں نے المورد کے رفقا کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ناگی صاحب کا ہر لحاظ سے مکمل خیال رکھیں۔

جب غامدی صاحب کو ناگی صاحب کی رحلت کی اطلاع ملی تو وہ بہت غم زدہ ہوئے۔ دوسرے دن انھوں نے کہا: اگرچہ ناگی صاحب کی وفات غیر متوقع نہیں ہے، تب بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو دل غمگین ہو جاتا ہے۔ اور پھر ان کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کی یادوں میں کھو جاتے اور ان کی باتیں کرنے لگتے تھے۔

اللہ جزا دے ڈاکٹر شہزاد سلیم، ڈاکٹر عظمت اللہ عرفان، محمد رفیع مفتی صاحب اور ڈاکٹر منیر احمد کو، ان حضرات نے دل و جان سے ناگی صاحب کی تیمارداری کی اور رفاقت کا حق صحیح معنوں میں ادا کیا۔ حتیٰ کہ اب ان کی وفات کے بعد ان کے گھر والوں کے ساتھ شفقت کا تعلق قائم رکھا ہے۔

ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اکثر و بیشتر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ جو دنیا سے جاتا ہے کچھ عرصے کے بعد لوگ اسے بھول جاتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس آزمائش کی زندگی میں نیکیاں کمانے میں ایسی زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ لوگ انھیں یاد رکھتے اور یاد کرتے رہتے

ہیں۔ بلکہ ان کے بعد ان کی باتیں کرنا بھی نیکی کا کام محسوس ہوتا ہے۔ ناگی صاحب نے بھی اس معاملے میں حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اشراق کے اس شمارے میں ہم خصوصی طور پر انھی نیکیوں کا اہتمام کر رہے ہیں۔

شہزاد سلیم

ایک مرد آہن کی رحلت

اگر دعوت دین کی لگن ایک انسان کو تندخو کے ساتھ ساتھ نرم خو بنائے، مقصد پرست کے ساتھ ساتھ بے لوث بنائے، جارح کے ساتھ ساتھ مجروح بنائے تو یہ تصویر یقیناً ہمارے پیارے اسحاق ناگی صاحب کی ہے۔ تین سال کی طویل مدت تک کینسر میں مبتلا رہنے کے بعد خدا کے اس عاجز بندے نے ۲۶ اگست کو تہجد کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کا تعلق پاکیزہ روحوں کے ایک نایاب گروہ سے تھا۔ ان کی ساری زندگی حق اور عدل کا ساتھ دیتے گزری۔

کوئی شخص ان کی بعض سخت آرا سے اختلاف کرسکتا ہے، مگر کسی کو ان کی نیت کی پاکیزگی سے اختلاف نہیں ہوسکتا ہے۔ ان کی طبیعت میں اخلاص اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی طبیعت کی تیزی حق کی خاطر تھی۔ تاہم دوسروں کی خطائیں معاف کرنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ کئی سال پہلے ان کے ایک دفتر کے ساتھی نے انھیں ایک نزاع کے نتیجہ میں زخمی کر دیا۔ ان کے ساتھی کو پکڑ لیا گیا، لیکن خدا کے اس رحم دل بندے نے اسے معاف کر دیا۔

وہ مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے دروس کے باقاعدہ شرکا میں سے تھے اور ان شخصیات کو اپنا دینی رہبر مانتے تھے۔ اگرچہ وہ ان حضرات فہم دین کو صحیح سمجھتے تھے، تاہم کئی معاملات میں وہ منفرد آرا کے حامل تھے اور دین کی تبلیغ کا بھی ایک منفرد انداز رکھتے تھے۔ وہ مولانا وحیدالدین خاں کے بھی مداحوں میں سے تھے۔ اپنی بچت کا بڑا حصہ وہ مولانا کی کتابیں خریدنے اور انھیں مفت تقسیم کرنے پر صرف کرتے۔ انھوں نے لوگوں کو دین سے قریب لانے کے لیے اپنے ذہن میں کتابوں کی ترتیب کا ایک خاکہ بنا رکھا تھا۔ اس ترتیب کے مطابق وہ لوگوں میں کتب تقسیم کرتے۔ اس کام میں انھیں روحانی خوشی حاصل ہوتی اور کبھی تکان محسوس نہ کرتے۔ لوگوں کو خدا

اور خدا کے دین سے قریب لانا ان کی زندگی کا مشن تھا۔ اس باب میں وہ یقیناً ایک ''خدائی خدمت گار'' تھے۔ جس ہسپتال میں وہ زیر علاج تھے اس کا بیشتر عملہ ان کا گرویدہ تھا۔ وہ ہر دفعہ ان کے لیے کتابچے لے کر جاتے اور نہایت دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ انھیں تقسیم کرتے۔ ناگی صاحب کی اس ادا نے ان کے دلوں پر یقیناً گہرا عکس ڈالا ہو گا۔

وہ اہل شرک اور بدعت سے بہت نالاں رہتے اور ان سے بہت سختی سے پیش آتے تھے۔ ان کا جذب درون اس طرح کے لوگوں کی اصلاح کرنے کے لیے انھیں بے قرار کر دیتا تھا۔ تاہم اس معاملے میں بھی ان کا اخلاص کسی بھی صاحب بصیرت سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔

ان کے پاس مناظرانہ لٹریچر پر بہت سی کتابیں تھیں اس فن کی نگارشات سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا۔ بیماری میں بھی وہ اس طرح کی کتب حاصل کرنے میں سرگرم رہتے۔ اپنی اس لائبریری کی وہ بہت حفاظت کرتے۔ اور کیوں نہ کرتے؟ آخر اس لائبریری میں بہت سی نایاب کتابیں بھی تھیں جو انھوں نے بہت محنت سے جمع کر رکھی تھیں۔ مگر اس حفاظت کے ساتھ ساتھ وہ انھیں سنجیدہ اور حقیقی طالب علموں کو دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے، بلکہ ضرورت پڑنے پر ان کو خود ایسے افراد تک پہنچا دیتے۔

انھوں نے ایک بہت سادہ اور تکلف سے پاک زندگی گزاری۔ اور کمال شان بے نیازی سے گزاری۔ تصنع اور بناوٹ ان کے قریب سے بھی نہ پھٹکے تھے۔ وہ ایک عاجز اور خدا ترس شخص تھے اور اپنی غلطی کے اعتراف میں انھیں کبھی باک نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک زندہ دل انسان تھے اور یاروں کے یار تھے۔ ان کی زبان میں بعض پنجابی محاورے درشت ہونے کے باوجود بھلے لگتے تھے۔ اپنے مخالفین پر اگر طنز کرتے تو اپنے آپ کو بھی مزاح کا نشانہ بناتے۔

کینسر کے موذی مرض میں وہ تین سال تک مبتلا رہے۔ اس سارے عرصے میں شاید ہی ان کی زبان پر خدا کے لیے شکوے کا کوئی کلمہ ان کے قریبی لوگوں نے سنا ہو۔ ان کا خدا سے ایک نہایت مضبوط اور گہرا تعلق تھا۔ خدا کی ذات پر انھیں بے پناہ اعتماد تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا: آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ ان شاء اللہ عنقریب شفایاب ہو جائیں گے۔ ان کا جواب کچھ اس طرح سے تھا: اگر میرے رب کو منظور ہے، تو مجھے بھی منظور ہے اور اگر اس کو منظور نہیں تو مجھے بھی منظور نہیں۔ اسی قسم کے الفاظ تقریباً ایک صدی پہلے مولانا محمد علی جوہر نے اپنی بیمار بیٹی کے بارے میں کہے تھے۔ تو ہمارے ناگی صاحب اپنے ایمان و توکل میں محمد علی جوہر سے کم نہ تھے۔

ان کے برخوردار ابراہیم ناگی نے تین سال تک ان کی بہت جانفشانی اور تن دہی سے خدمت کی۔ یقیناً ان کو اپنے بیٹے پر فخر محسوس ہوتا ہوگا۔ ہم سب کے لیے یہ بات بہت پرمسرت اور قابل فخر تھی کہ ان کے اس مثالی بیٹے نے اپنے والد محترم کی نماز جنازہ پڑھائی۔

آج ناگی صاحب ہم میں نہیں ہیں۔ تاہم ان کی یادیں ہمیشہ ہمارے دل میں موجود رہیں گی اور لہو کو گرماتی رہیں گی۔ انھوں نے خدا کے دین کی خدمت بے لوث انداز سے کی اور حق کی شمع کو اپنے خون جگر سے جلائے رکھا۔ وہ راہ حق کے سپاہی بھی تھے اور کمانڈر بھی۔ انھوں نے خود اپنے آپ کو اس مورچے پر فائز کیے رکھا۔ حق کے معاملے میں انھوں نے کبھی مداہنت نہیں برتی۔ جس بات کو صحیح سمجھتے اس کا اظہار برملا کرتے۔ وہ راہ حق کے ایک مرد آہن تھے!

محمد رفیع مفتی

محمد اسحاق ناگی مرحوم

اسحاق ناگی مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۷۶ء میں ہوئی تھی۔ اُس وقت اُنھوں نے گلیکسو لیبارٹریز لاہور میں بطور سٹینوگرافر اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ جبکہ میں وہاں تین سال پہلے سے ملازمت کر رہا تھا۔

ایک دن میں اُن کے کمرے میں اپنی کسی دفتری ضرورت کے لیے گیا۔ یہ غالباً میری اُن کی پہلی ملاقات تھی۔ اُنھوں نے مجھ سے باتوں ہی باتوں میں کہا کہ میں خود کو بدلنا چاہتا ہوں، میں صحیح مذہب سیکھنا اور اُس پر عمل کرنا چاہتا ہوں، مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں؟ میں نے کہا کہ آپ قرآن مجید پڑھیں۔ اُنھوں نے اس پر مجھ سے کوئی اور بات نہیں کی سوائے اِس کے کہ اِس کا کیا طریقہ ہے؟ میں خود اُن دنوں مرحوم ڈاکٹر اسرار احمد کے دروس قرآن سنا کرتا تھا، تو میں نے اُنھیں بھی کہا کہ مسجد شہدا میں ہر اتوار کو ڈاکٹر اسرار صاحب کا درس ہوتا ہے آپ اُس میں آیا کریں۔ ناگی مرحوم ایسے شخص نہیں تھے کہ اُنھیں کوئی فیصلہ کر لینے کے بعد اُس پر عمل کے لیے کسی یاد دہانی کی ضرورت ہوتی۔ وہ خود یاد دہانی کرانے والوں میں سے تھے۔ پھر میں نے یہی دیکھا کہ وہ بڑی باقاعدگی سے ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے دروس میں شامل ہونے لگے۔ مجھے نہیں یاد کہ اُن دنوں میں اُنھوں نے ڈاکٹر اسرار صاحب کا کوئی درس چھوڑا ہو۔

پھر اُنھیں جماعت اسلامی کے ایک کارکن نے بتایا کہ لاہور میں دو ہی درس قرآن ہو رہے ہیں، ایک تو وہی جو آپ سن رہے ہیں اور دوسرا جاوید احمد نامی ایک نوجوان کا درس۔ پتا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دوسرا درس اچھرہ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی گلی میں ہوتا ہے۔ برگد کے سائے تلے برگد ہی پروان چڑھتا اور اسد کے سائے میں شِبل ہی جیتا ہے۔

اُس وقت تک اسحاق ناگی مرحوم نے کئی دروس سن رکھے تھے، مگر معلوم نہیں کہ اُس نوجوان کے اِس درس میں کیا

جادو تھا کہ تلاش مرشد کا سفر ہی ختم ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا، ناگی صاحب اپنے استاذ سے جو کچھ سیکھتے دوسروں تک اُس کو پہنچانے اور انھیں اُس کی طرف مائل کرنے میں مصروف نظر آتے تھے۔

وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک داعی تھے۔ اپنی ذاتی زندگی میں تو ہم نے اُنھیں دیکھا ہے کہ وہ مومن کی کچھ فولادی صفات سے بھی متصف تھے، لیکن دوسروں تک خدا کی بات پہنچانے، اُنھیں دین سمجھانے اور اُس کی طرف راغب کرنے کے معاملے میں بے شک وہ مثل حریر و پرنیاں تھے۔

اُن کی دلچسپی کی سرگرمیاں توحید کا جوشیلا ابلاغ، شرک کا بُری طرح سے ابطال اور بدعات کا بہت حقارت کے ساتھ قلع قمع رہی ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ پنجاب کے روایتی کلچر کے مطابق بعض اوقات اُن کی زبان پر دشمنانِ خدا کے لیے سب وشتم بھی جاری ہو جاتا، میں اُس وقت سوچا کرتا تھا کہ اِن کے اِس سب وشتم کو تو بدی کا فرشتہ بھی نیکی کر کے ہی لکھتا ہوگا۔

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (الفرقان ۲۵: ۷۰)

''پس یہی ہیں وہ لوگ جن کی غلطیوں کو اللہ نیکیوں میں تبدیل کر دے گا۔''

یوں تو ہر آدمی کی ایک پوری کہانی ہوتی ہے اور جیسا وہ شخص ہو ویسی ہی اُس کی کہانی ہوتی ہے۔ ناگی صاحب کی زندگی کے بعض واقعات بہت ایمان افروز ہیں۔ یہ چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ اُن کی ٹانگ میں شدید درد پیدا ہو گیا، یہ درد کئی ماہ چلتا رہا، مختلف علاج کرائے لیکن آرام نہیں آیا۔ ایک دن فیکٹری سے چھٹی کے وقت وہ فیکٹری کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد بڑی تکلیف کی حالت میں گھر کی طرف نکل رہے تھے کہ اُن کے ایک ساتھی، جسے وہ اکثر شرکیہ تصورات سے بچنے اور توحید کے بارے میں حساس رہنے کی دعوت دیا کرتے تھے، اُس نے ٹانگ کی درد کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے اُسے بتایا کہ ٹانگ کی درد برقرار ہے اور بڑی شدید ہے۔ تو اُس نے کہا کہ آپ اپنے عقیدے پر غور کریں، اُس کی مراد یہ تھی کہ آپ اِس کے لیے تعویذ اور گنڈے وغیرہ کا راستہ اختیار کریں اور توحید و شرک کے حوالے سے جو تعلیم دیتے پھرتے ہیں اُس سے باز آ جائیں۔ ناگی مرحوم اُس کی یہ بات سن کر الٹے پاؤں مسجد میں واپس آ گئے اور وہاں درد کی اُسی حالت میں خدا سے اپنا دکھ درد اور توحید اختیار کرنے پر لوگوں کے ملنے والے طعنوں کو بیان کرنے لگ گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے عصر سے مغرب تک اللہ سے دعا کی اور پھر جب مغرب کی نماز ادا کر کے میں مسجد سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ ٹانگ کا ناقابل برداشت درد یکسر دور ہو چکا ہے اور پھر زندگی بھر کبھی ٹانگ کی وہ تکلیف دوبارہ میں نے محسوس نہیں کی۔

مرحوم تقریباً ڈھائی سال سے کینسر کے جان لیوا مرض میں مبتلا تھے، اِس لمبے عرصے میں ہم نے اُن کی زبان سے خدا کی رضا پر راضی اور اُس کی طرف سے مقدر فیصلوں پر اطمینان کے علاوہ کوئی اور بات نہیں سنی۔ اُن کی اِس بیماری کے دوران کئی دفعہ یہ خیال آیا کہ جیسے وہ خود کسی کے ساتھ نیکی، خیر اور بھلائی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اُس کی حالت اور اُس کے حوصلے کو دیکھا نہیں کرتے تھے، شاید اِسی طرح خدا اُنھیں اپنی جنتوں کی طرف کھینچے چلا جا رہا ہے، بہر حال، وہ خدا کے تھے، خدا اُن کا تھا، ہمیں کیا معلوم کہ معاملہ کیا تھا۔

ہماری دعا ہے:

خدا مغفرت کرے کہ اب جنت میں وہ بسیں

طالب محسن

مردحر

اسحاق ناگی صاحب ایک متحرک جنگجو اور مجاہد ٹائپ آدمی تھے۔ وہ میرے ایک ممدوح کی حیثیت اس لیے رکھتے تھے کہ ان کی شخصیت کا یہ سارا زور بالعموم اللہ کی بات کے حق میں صرف ہوتا تھا۔

توحید کا ایک غیرت مند علم بردار، بدعت کا ایک بے لچک دشمن، خواہ خاندان ہو یا دوست داری ہر جگہ دینی تعلق کو فوقیت دینے والا، مالی حالات کی خرابی کے باوجود دین کی نصرت میں اپنا مال اور اپنے اوقات صرف کرنے والا۔

ان کی زندگی دین کے لیے جدوجہد سے عبارت ہے یہ تو ان سے معمولی تعارف رکھنے والا بھی جان لیتا، لیکن وہ انسانوں کی خدمت کا غیر معمولی جذبہ رکھتے اور اس کے لیے ہمہ وقت مصروف عمل رہتے تھے۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کے کئی مظاہر کا عینی شاہد ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جس کے ساتھ بھی وابستہ ہوئے انھوں نے وابستگی کے تقاضے پورے کیے۔

خدا کی بندگی، دین کی خیر خواہی، اہل دین سے محبت اور ان سے وابستگی اور ان کاموں میں آنے والی رکاوٹوں کے مقابلے میں مردانہ وار جدوجہد کی اسحاق ناگی صاحب ایک علامت تھے۔

میں چند سال پہلے حج کے سفر پر گیا تو محترم اسحاق ناگی میرے شریک سفر تھے۔ کوئی ڈیڑھ مہینا، ہم اکٹھے سوئے، اکٹھے چلے، اکٹھے کھایا اور اکٹھے سفر کیا۔

سفر سے پہلے ناگی صاحب کے غصے، زبردستی، خواہ مخواہ دخل اندازی سے مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کچھ مشکلات پیدا ہوں گی، لیکن ان کی للّٰہیت، شوق و ذوق، ہم سفروں کی خدمت، ان کے لیے ایثار، اپنی بات اور اپنی خواہش کو دبا کر دوسرے کو ترجیح دینا اور اس طرح کے کتنے ہی محاسن تھے جن کے باعث مجھے اپنے اندیشے پر آج بھی افسوس ہے۔

میں نے تاریخ میں کتنے ہی لوگوں کے لیے مرد حر کی تعبیر پڑھی ہے۔ میرے خیال میں سچا مرد حر وہ ہے جو صرف حق کو مانتا اور حق کے لیے لڑتا ہو اور حق کی خاطر نہ کسی کی پروا کرتا ہو اور نہ کسی کو خاطر میں لاتا ہو۔ اسحاق ناگی صاحب ایسے ہی مرد حر تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ساجد حمید

اسحاق ناگی صاحب

اگر خدا انسانوں کو اس وجہ سے چنے کہ ''یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے تھا''، تو شاید اس عہد کے لوگوں میں ناگی صاحب صف اول میں کھڑے ہوں گے۔ اس شخص کی ساری زندگی لوگوں سے اس بات کے لیے لڑتے ہوئے بسر ہوگئی کہ یہ بات صحیح ہے وہ نہیں، وہ صحیح ہے یہ نہیں۔ اس طرز عمل کی بنا پر انھیں مارا پیٹا بھی گیا، انھیں شدید زخمی ہو کر ہسپتال بھی جانا پڑا، لیکن انھوں نے اپنا یہ طرز عمل ترک نہیں کیا ان کا اصول شاید یہ تھا کہ (اسد اللہ خان غالب سے معذرت کے ساتھ)

نہ رکو گر برا کہے کوئی
''روک لو گر غلط چلے کوئی''

آخری بیماری میں بھی یہ کام چلتا رہا، میں تیمارداری کے لیے گیا تو کوئی صاحب ملنے آئے تھے، ان کو اسی طرح کی کوئی بات سمجھا رہے تھے۔ میرے اٹھنے سے پہلے ایک اور صاحب آئے اور ان سے بھی کچھ ایسی بات شروع ہوگئی تھی۔ چند ماہ پہلے میں نے ان سے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں ایک کتاب طلب کی تو انھوں نے کراچی سے مجھے منگوا کر دی۔ بیماری کی شدت کے باوجود بار بار کبھی کراچی فون کرتے اور کبھی مجھے، یہاں تک کہ وہ کتاب پہنچ گئی۔ ایسا کوئی کام آپ ان سے کہہ دیں، شاید آپ بھول جائیں، وہ نہیں بھولتے تھے۔

جن لوگوں کو پسند کرتے، یا جن کے وہ عقیدت مند تھے، ان کو بھی اپنی تنقید سے بلند نہیں سمجھتے تھے۔ آپ عارف ہوں یا عامی، اس شخص کے نقد سے بچ نہیں سکتے تھے، لیکن یہ حیرت انگیز بات تھی کہ جب وہ نقد کر لیتے تو ان کو آپ صفائی میں کوئی بات کہیں تو وہ فوراً مان جاتے تھے۔

دین کی دعوت، اصلاح فکر اور احباب واعزہ کی خدمت ان کے غالب اوصاف حمیدہ تھے۔ انھی تین دائروں میں

وہ ساری زندگی اپنی توانائی صرف کرتے رہے۔ان تینوں دائروں میں ان کی کیفیت وہی رہی جو فیض احمد فیض نے بیان کی ہے کہ

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے مالی حالات اچھے نہیں رہے، لیکن شاید ہی کسی نے اس کے بارے میں ان سے شکوہ سنا ہو۔ بہت قریبی لوگوں کے سوا اس بارے میں کہیں بات نہیں کرتے تھے۔

وہ بظاہر ایک عام آدمی تھے، لیکن اسلام کی تاریخ، بالخصوص عہد نبوی، عہد صحابہ سے عہد بنوامیہ تک کے وہ ایک جید عالم تھے۔اس کی باریک باریک تفصیلات سے بھی آگاہ تھے۔اسی طرح فرقہ دارانہ مسائل جیسے اہل سنت اور شیعہ، اہل حدیث اور اہل فقہ کے اختلافی مسائل کے وہ علما سے بڑھ کر ماہر تھے۔ میں پچھلے چند سالوں سے ان سے کہتا رہتا تھا کہ تاریخ اسلام سے متعلق اپنی دریافتیں کہیں رقم کر دیں، وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے میں لکھ نہیں سکتا۔

میرا ان کا تعلق بہت پرانا ہے، شاید ۱۹۸۵ء کے اواخر سے۔ ۱۹۸۸ء میں انھوں نے مجھے کہا کہ مجھے عربی پڑھا دو۔ میں نے پڑھانا شروع کی، مجھے اور انھیں، دونوں کو محسوس ہوا کہ شاید یہ کام نہیں ہو سکے گا۔اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ عمر میں میرے بڑوں کی طرح تھے، استادی شاگردی کا رشتہ بن ہی نہیں پا رہا تھا۔ بہرحال وہ پروگرام ختم ہو گیا، اس کے بعد وہ ہمیشہ مجھے جب بھی ملتے تو کہتے: اے میرا پھگوڑا استاد اے (پنجابی)۔(یعنی وہ استاد جو پڑھائی کے درمیان بھاگ گیا، اس میں لطف کی بات یہ تھی کہ یہ تعبیر شاگرد کے لیے استعمال ہوتی ہے استاد کے لیے نہیں)۔ میں طبعاً کم آمیز ہوں، اس لیے انھیں مجھ سے شکایت رہتی تھی کہ کم ملتا ہوں، لیکن میری اس کم آمیزی کے باوجود ان کی طرف سے کبھی عزت اور پیار میں کمی نہیں آئی۔

ان کا مرض شدت اور طوالت اختیار کر گیا، تو ان کی طرف سے اکثر دعا کے لیے SMS آنے لگے۔ان کے ایک پچیس تیس سالہ دوست میرے ہمسائے ہیں، جو ان سے ملنے جاتے رہتے تھے۔ ناگی صاحب نے اس شدید مرض کا تذکرہ جب ان سے کیا تو انھوں نے ناگی صاحب سے کہا کہ اللہ تمھارے گناہ اچھی طرح دھونا چاہتا ہے۔تو ناگی صاحب نے کہا اللہ کرے ایسا ہی ہو۔خدا کے بارے میں وہ ہمیشہ مطمئن رہے کہ وہ ان کا رب ہے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس بات پر کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ایک دعا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات پر مغفرت کی بشارت دی ہے۔اب یہی دعا ہے کہ اللہ کے حضور میں وہ اس طرح سے حاضر ہوئے ہوں کہ ان کے دامن پر کسی گناہ کا ہلکا سا بھی میل نہ ہو، اور انھیں خدا کی مغفرت اور رضوان حاصل ہو۔ آمین۔

ریحان احمد یوسفی

جس کے لیے جیے تھے اسی سے ہیں جا ملے

مرنا ہر شخص کو ہے۔ یہ اہم بات نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ مرنے کے بعد زندگی دینے والے کی بارگاہ میں کسی شخص کا استقبال کس حیثیت میں کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ غیب کی باتیں ہیں جو قیامت سے قبل کوئی نہیں جان سکتا۔ مگر انسان جس طرح جیتا ہے، اس سے بڑی حد تک یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کا استقبال کس طرح کیا جائے گا۔

اسحاق ناگی صاحب کے لیے بھی آخر کار موت کا وہ دروازہ کھل گیا جو ہر انسان کا مقدر ہے۔ مگر ناگی صاحب کے متعلق ان کے جاننے والے یہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے دین کی نصرت کے لیے جیے۔ میں ذاتی علم کی بنیاد پر یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک دین پھیلانے کی جدوجہد میں مصروف رہے۔

ناگی صاحب سے میرا تعارف تو پرانا تھا، مگر ان سے ربط ضبط اس وقت بڑھا جب ۲۰۰۶ء میں میرے رسالے کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوئی۔ وہ میرے مضامین کو پسند کرتے اور فون کر کے مختلف تحریروں کی تحسین کیا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو لکھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اس پس منظر میں وہ اپنے بعض مشاہدات اور خیالات مجھ تک پہنچاتے تھے کہ میں انھیں تحریر کے قالب میں ڈھال کر لوگوں تک پہنچا سکوں۔ ایسی ہی ایک تحریر میں اس ماہ کے شمارے میں شائع بھی کر رہا ہوں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ ایک مخلص داعی کو اللہ تعالیٰ کس طرح موثر بنا دیتے ہیں۔ ان کا درد دوسروں کو بھی آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ ان کی آواز میں اپنی آواز ملا کر ان کا پیغام دور دور تک پہنچائیں۔

ناگی صاحب ایک پرجوش داعی تھے۔ وہ عالم داعی نہیں، بلکہ کارکن داعی تھے۔ ایسے کارکن جن کے جوش عمل اور

جذبۂ جنوں کے بغیر کسی عالم کا پیغام اس کی ذات سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ ناگی صاحب کا جوش وجنوں ہی تھا جو عمر بھر بڑے اہل علم کا پیغام دوسروں تک پہنچاتا رہا، تاہم ناگی صاحب کی یہ وابستگی اہل علم سے کسی تعصب کی بنا پر نہیں تھی بلکہ ان کی اصل وابستگی اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ تھی۔ چنانچہ ہمارے اساتذہ جیسے محقق اہل علم ہوں یا اس (مجھ) عاجز جیسا کوئی معمولی طالب علم، انھیں جہاں محسوس ہوتا کہ دین حق کا پیغام موثر طریقے پر دوسروں تک پہنچ سکتا ہے، وہ اس ذریعے کو استعمال کرتے اور حق کی امانت پورے ولولے کے ساتھ آگے منتقل کر دیتے۔

اس معاملے میں ان کی وابستگی جس سطح پر پہنچی ہوئی تھی اس کا اندازہ مجھے ان کی زندگی کے آخری ایام میں ہوا۔ وہ دو تین برس سے کینسر جیسے موذی مرض سے جنگ کر رہے تھے۔ یہ ایک سخت اور تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ ان اذیت ناک دنوں میں، جب لوگوں کو اپنے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا، ناگی صاحب مجھے بار بار فون کرتے اور میری ایک تصنیف منگوا کر نہ جانے کہاں کہاں پہنچاتے۔ آخری وقت میں حال یہ ہو چکا تھا کہ جب ان کا فون آتا تو وہ اس اذیت میں ہوتے کہ اُن کی زبان اُن کا ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔ میں بمشکل تمام ان کا مدعا سمجھ کر کتاب بھجواتا۔ میں نے جب ان سے کتاب کی قیمت لینا بند کر دی تو انھوں نے مجھے فون کرنے کے بجائے میرے اسسٹنٹ کو فون کرنا شروع کر دیا۔ یہ حساسیت کی انتہا ہے۔

خالق کی حمیت کے ساتھ خلق کی ہمدردی کا جذبہ بھی ان میں بڑا گہرا تھا۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ان کی بیماری کے آغاز سے ذرا قبل اس وقت ہوا جب میں خود ایک مہلک مرض کا شکار ہو گیا۔ مشکل اور لاعلاج امراض میں حکیمی نسخے ہر دوسرا شخص بتا رہا ہوتا ہے۔ میں ان دنوں اس طرح کی چیزیں سن سن کر بہت بے زار تھا اور ایسے ٹوٹکوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا۔ ناگی صاحب کو میری بیماری کا علم ہوا تو بار بار فون کر کے خیریت معلوم کرتے۔ پھر انھوں نے مجھے ایک ایسا ہی مجرب، موثر اور آزمودہ نسخہ بتایا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ بس سن لیا۔ دوبارہ فون کرنے پر جب انھیں یہ علم ہوا کہ ابھی تک میں نے ان کے نسخے پر عمل نہیں کیا تو انھوں نے مجھے قائل کرنا شروع کیا۔ نہ جانے کتنے دنوں تک کتنی ہی دفعہ انھوں نے مجھے اس مقصد کے لیے فون کیا اور کس کس طریقے سے اس کے موثر ہونے کی یقین دہانی کرائی۔ آخر کار ان کی محبت، اخلاص اور اصرار دیکھ کر مجھے ان کی بات پر عمل کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ خود کینسر کی زد میں آ گئے اور آنے والے دنوں میں اس موذی مرض کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

میرے پاس ان کا فون بہت مستقل مزاجی سے آیا کرتا تھا۔ آخری کچھ عرصے میں ان کا فون آنا بند ہو گیا۔ میں لاہور میں مقیم مختلف احباب سے ان کی خیریت معلوم کرتا رہتا تھا۔ آخر کار ۲۶ اگست کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ خدا

کے دین کا یہ جانباز، نقدیِ عمر راہ خدا میں لٹا کر اس ہستی کے حضور میں پیش ہو چکا ہے جو آسمان و زمین کے سارے خزانوں کا مالک ہے۔ اور اس کی عطا سب سے بڑھ کر ان خدام کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو اپنی زندگی اس کے نام وقف کر دیتے ہیں۔ جن کی ہر نفرت اور محبت زندگی بھر صرف خداوند ذوالجلال کے حوالے سے رہتی ہے۔ اسحاق ناگی صاحب ایسے ہی صلحا میں سے تھے۔ میری امید اور دعا ہے کہ پروردگار عالم ان کے ایام زندگی کی آخری سختیوں کو ان کی کوتاہیوں کی تلافی کا ذریعہ بنا دے۔ درگزر کا یہ پروانہ ذات اقدس سے مل جائے تو پھر صلے میں ملنے کو عطا و رضا کی وہ بادشاہی رہ جاتی ہے جو لازوال ہے۔

میں شعر کہنے کا ذوق نہیں رکھتا، مگر نہ جانے کیوں ناگی صاحب کے لیے ایک شعر بے اختیار موزوں ہو گیا ہے۔ اسی شعر پر یہ مضمون ختم کر رہا ہوں۔

جس کے لیے جیے تھے اُسی سے ہیں جا ملے
لاریب ہر وفا کا صلہ پا چکے ہیں ہم

محمد بلال

ابھی آنکھ کھل جائے گی.....

اسحاق ناگی مرحوم کے اکلوتے بیٹے ابراہیم نے اُن کے آخری ایام میں اُن کی یادداشت کو چیک کرنے کے لیے ان سے پوچھا:

''میں کون ہوں۔''

تو انھوں نے بولنے کی کوشش کی:

''اب...ر...را...''

وہ اُس کا نام ادا کرنا چاہتے تھے۔ یہ آخری حروف تھے جو بستر مرگ پر ان کی نحیف زبان سے ادا ہوئے۔..... لیکن ان کے احباب جانتے ہیں کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرح توحید کے معاملے میں بے حد حساس تھے۔ توحید کے تقاضوں کی تکمیل میں وہ رشتے داروں اور دوستوں کی ناراضی کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ کسی قسم کی آتش نمرود ان کے اندر کوئی خوف پیدا نہ کر پاتی تھی۔ قدرت نے انھیں یہ اعزاز عطا کیا کہ ان کی زبان سے آخری نام اُس ہستی کا ادا ہوا جس کے ساتھ ان کے عقیدہ وعمل کی گہری معنوی مناسبت تھی۔

وہ میرے دوست بھی تھے، سسر بھی اور محسن بھی۔ دوست پہلے بنے اور سسر بعد میں۔ لہٰذا اس ترتیب اور ترجیح کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ ایک دن مجھے دوستانہ مشورہ دیا:

''.....ایسے معاملات میں سسرال کی بات نہ ماننا.... میں بھی نہیں مانا کرتا تھا۔''

ایک دن اپنی بیٹی کو عجیب وغریب بات کہہ دی:

''بلال پڑھنے لکھنے والا آدمی ہے۔ اسے کبھی ٹینشن نہ دینا۔ اگر کبھی تم دونوں کا جھگڑا ہوا تو میں بلال کا ساتھ

دوں گا۔‘‘

میرے محسن ..... غیر معمولی ..... مجھے فکر اصلاحی و غامدی ہی سے نہیں بلکہ ان نادر شخصیات سے ذاتی طور پر بھی متعارف کرایا۔ انھی کے تعلق اور صحبت کے باعث اللہ کی توفیق ملی اور دین کے ساتھ شعوری تعلق قائم ہوا۔ یوں مجھے ناگی صاحب ہی کے ذریعے سے راز حیات کی معرفت بھی ملی اور شریک حیات کی راحت بھی۔

ان کا اللہ کے ساتھ تعلق.... قابل رشک.... تہجد باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ اُس وقت اللہ سے باتیں کرتے۔ پنجابی میں ..... دل کی بات مادری زبان ہی میں ہو سکتی ہے ..... وہ اللہ کے بے تکلف دوست تھے۔ اکثر شکر کرتے۔ کبھی کوئی تقاضا کرتے۔ کبھی شکوہ بھی کرتے۔ کبھی لڑتے۔ مگر اس بات کے پختگی کے ساتھ قائل تھے کہ اللہ سے مانگا، ملا، تو خوشی ہوئی کہ میری مرضی پوری ہوئی، نہ ملا، تو زیادہ خوشی ہوئی کہ اُس کی مرضی پوری ہوئی ..... دنیا میں آخری سانس بھی تہجد کے وقت لیا۔ دوسرے الفاظ میں عالم برزخ میں دوسری زندگی کا پہلا سانس بھی تہجد کے وقت لیا۔ ..... وہ اُس وقت اللہ کے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ دوستی عروج پر ہوتی تھی۔ اللہ نے اپنے دوست کو اپنے پاس بلانے کے لیے اُسی وقت کا انتخاب کیا۔ ناگی صاحب کو کم مسافت طے کرنی پڑی۔ اب دونوں دوست خوش ہیں ..... اور ہم اداس۔

اللہ پر ایمان ..... حیرت انگیز ..... کسی نے کہا کہ فلاں درخت پر جنات کا سایہ ہے۔ سب لوگ اس درخت سے ڈرتے تھے۔ اس کے قریب سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ انھوں نے کہا: میں رات کو اس درخت کے نیچے چار پائی بچھا کر سوؤں گا۔ کہتے تھے: اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دوں گا۔ دیکھتا ہوں میرا کوئی کیا بگاڑتا ہے۔ ایک دن جناب جاوید احمد غامدی لطیف موڈ میں بیٹھے تھے۔ میں نے انھیں یہ بات سنائی۔ غامدی صاحب بولے: جنات نے ان کے پاس آ کر ان سے مار کھانی ہے۔

تحقیق نئی دریافتوں کا سفر ہے۔ وہ ایک مسافر تھے۔ بہت تیز اور بے چین مسافر۔ علم و تحقیق کے بعض میدانوں پر انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ کچھ ریسرچ اسکالرز بھی اس معاملے میں ان سے مدد لیتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اُن امور کا انھیں ’’امام‘‘ قرار دیتے تھے۔ تحقیق کے بعد جس بات کو حق سمجھ لیتے، اس کے اظہار میں پھر کسی مصلحت کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

وہ ہر وقت توانائی سے بھرپور ہوتے تھے۔ ان سے کم عمر جوان انھیں نوجوان بزرگ قرار دیتے تھے۔ حج کرنے گئے تو ان کے گروپ میں ایک رشتے دار محترمہ کے سوا سب ان سے چھوٹے تھے۔ مگر حج میں ان محترمہ کی بھی دیکھ بھال کی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے سے کم عمر لوگوں کا سامان خود اٹھا اٹھا کر گاڑیوں میں رکھتے اور اتارتے تھے۔ بعد

میں ان جوانوں نے اعتراف کیا کہ اگرنا گی صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم کیسے حج کرتے۔ رات کے وقت سخت سردی میں میرا بچہ باہر جا کر کچھ کھانے کی ضد کرتا تو میں سستی کا شکار ہو جاتا اور بچے کو ٹال دیتا مگر وہ اسے باہر لے جاتے اور اس کی ضد پوری کرتے۔ جب آخری دنوں میں بہت کمزور ہو گئے اور لاٹھی کے سہارے سے چلنے پر مجبور ہو گئے، تب بھی میری بیٹی بصیرت کوئی ضد کرتی تو لاٹھی کا سہارا لے کر بازار جاتے اور اسے اس کی پسند کی چیز لا کر دیتے تھے۔

اسی طرح وہ مختلف مسائل کا شکار لوگوں کی مدد کے لیے ہر دم تر و تازہ ہوتے تھے۔ مالی مشکلات کے باوجود لوگوں کی مالی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایک دوست کی بیٹی اور بہو کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ خود اسے حل نہ کر سکے۔ انھیں بیچ میں ڈالا۔ انھوں نے ایک ہی ملاقات میں صلح صفائی کرا دی۔ لوگ انھیں کام کہہ کر خود بھول جاتے، مگر وہ یاد رکھتے اور کام ہونے تک بے چین رہتے۔ بعض لوگ انھیں کام کہنے کے لیے بات شروع کرتے تو یہ آدھی بات سن کر ہی مسئلہ سمجھ جاتے اور دوسرے کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی موبائل فون پر متعلقہ آدمی سے رابطہ کر چکے ہوتے۔

آہ! دوسروں کے درد کا درماں خود درد بے دوا کا شکار ہو گیا اور ہمیں ایک دائمی درد میں مبتلا کر گیا۔

۶ ستمبر کو ہمارے ہاں یوم دفاع منایا گیا۔ ٹی وی پر بہادر فوجیوں کی باتیں کی جا رہی تھیں۔ ان کی بیٹی مریم اسحاق نے مجھے ایس ایم ایس کیا:

''آج شہیدوں کی خدمات کے قصے سن کر بابا کے کام یاد آئے۔ جو وہ اور ان کا رب ہی جانتا تھا۔ وہ گم نام سپاہی تھے۔''

بے شک وہ سپاہی تھے۔ شہید سپاہی۔ وہ حق کے شہید تھے۔ جس بات کو حق سمجھ لیتے، پھر ہر خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی گواہی دیتے تھے۔ اس کے لیے لوگوں سے لڑتے تھے۔ دلائل کے ہتھیاروں سے۔ قرآن حق و باطل کا معیار ہے۔ اس کے خلاف کوئی بات، کوئی حکایت، کوئی روایت نہیں مانتے تھے۔ معاشرے کی وہ پسندیدہ رسمیں اور روایتیں جو قرآن کے ساتھ متصادم ہیں، ان پر بھرپور حملے کرتے تھے۔ ان کی یہ جنگ اس وقت بھی جاری رہی جب کینسر ان پر کامیاب حملہ کر چکا تھا۔ مگر یہ حملہ صرف جسم پر تھا، ان کا دعوتی جذبہ پوری طرح صحت مند اور جوان تھا۔ وہ اپنی کمزور آواز میں بھی شہادت دیتے رہتے تھے۔ موبائل ان کے سرہانے کے پاس ہوتا تھا۔ کال کریں یا ایس ایم ایس۔ نغمۂ جبرائیل سناتے رہتے۔ بانگ سرافیل دیتے رہتے۔ شان براہیمی دکھاتے رہتے۔ چراغ مصطفوی جلاتے رہتے۔

۲۵ اگست کی شام کو میں نے انھیں آخری بار بالکل ساکت ہو کر نم ناک دل کے ساتھ دیکھا۔ وہ بستر پر تھے۔ چادر اوڑھی ہوئی۔ تشویش انگیز گہری نیند میں۔ وہ سانس لینے میں دقت محسوس کر رہے تھے اور مجھے اپنے دل کی دھڑکن

سنائی دے رہی تھی۔..... پھر میں دفتری کام کے سلسلے میں دبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔..... وہاں ان کی وفات کی دردناک اطلاع ملی۔ دکھ جسم کے ریشے ریشے میں سرایت کر گیا۔ حواس معطل ہو گئے.....لاہور آیا تو ان کی قبر دیکھی .....نا گی صاحب قبر میں.....مٹی اوڑھی ہوئی.....زمین کے اندر.....دل یہ صورت حال قبول نہیں کر رہا.....زندگی بھر زندہ دلی کے ساتھ زندگی گزارنے والا.....زندگی سے معمور.....بزرگی میں بھی جوانوں کی توانائیوں سے بھرپور..... سراپا دعوت.....لوگوں کو دنیوی اور ابدی زندگی کی خوشیاں بانٹنے والا.....خود زندگی سے محروم؟.....نہیں..... یہ کوئی خواب ہے..... برا خواب.....ابھی آنکھ کھل جائے گی.....ان کی زندگی افروز سرگرمیوں کے مناظر میری آنکھوں کے آگے لہرا رہے ہیں.....ان کی جان دار آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی ہیں.....ان کے کھلکھلاتے ہوئے قہقہے پردۂ سماعت کے ساتھ ٹکرا رہے ہیں.....ان کے جوانوں کی چیخیں نکال دینے والے معانقے دکھائی دے رہے ہیں .....وہ اب ہم میں نہیں رہے؟.....نہیں.....دل یہ صورت حال قبول نہیں کر رہا..... یہ کوئی خواب ہے..... برا خواب .....ابھی آنکھ کھل جائے گی!

نعیم احمد بلوچ

حمیت دینی میں مصلحت ناآشنا

محمد اسحاق ناگی مرحوم سے میرا پہلا تعارف اس حوالے سے تھا کہ وہ استاذ محترم جاوید احمد غامدی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے دروس میں باقاعدگی سے آنے والوں میں سے ایک تھے۔ وہ ہمیشہ ان نشستوں میں وقت سے بہت پہلے آجایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ تمام دروس کو باقاعدہ ریکارڈ کرتے تھے۔ ان سے واقفیت کی راہ اس طرح کھلی کہ وہ درس قرآن ختم ہونے کے بعد شرکا سے علیک سلیک میں ہمیشہ پہل کرتے۔ ان کا دوسروں سے سلام کرنے کا طریقہ خاص طور پر 'قابل دید' اور یاد رہ جانے والا تھا۔ وہ سلام کے بجائے دلچسپ اور مزاحیہ جملوں کے ساتھ مخاطب پر 'حملہ آور' ہوتے۔ میرے لیے اس میں حیرانی اور دلچسپی کی کئی باتیں ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ وہ کم وبیش ہر ملنے والے کو 'سید' کے خطاب سے مخاطب کرتے اور اس سنجیدگی سے کرتے کہ ایک عرصہ میں یہی سمجھتا رہا کہ واقعی ان کے یہ ملنے والے 'سید' فیملی سے ہوں گے، لیکن جلد ہی یہ عقدہ مجھ پر کھل گیا کہ وہ 'سید' اصطلاحی معنوں میں نہیں، بلکہ لغوی معنوں میں کہتے ہیں۔ دراصل انھوں نے مجھ سے دو چار ملاقاتوں ہی کے بعد ''زبردستی' بے تکلفی شروع کر دی تھی اور اس کے نتیجے میں جب انھوں نے مجھے بھی 'سید' کہا تو میں نے بڑی سنجیدگی سے ان کی غلط فہمی دور کی۔ تب انھوں نے یہ 'راز' فاش کیا کہ 'سید' تو مسٹر یا جناب کا عربی ترجمہ ہے اور یہ قصہ بھی سنایا کہ جب مشہور بھارتی رہنما اور پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے سعودی عرب کا سرکاری دورہ کیا تو تمام عربی اخبارات نے اپنی سرخیوں میں انھیں 'سید' کہا تھا۔

اسحاق ناگی صاحب کی بے تکلفی کے باوجود اپنی افتاد طبع کے باعث میں ان سے ایک فاصلے ہی پر رہا، لیکن ان کی شخصیت کے خصائص وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ ان کی شخصیت کا ایک خاص پہلو اس وقت سامنے آیا جب ایک درس قرآن میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک کتاب ''مذہبی داستانوں کی

حقیقت'' کے حوالے سے گفتگو کی۔ مولانا نے کتاب کی بہت تحسین کی اور ساتھ ہی ناگی صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ہی یہ کتاب انھیں مہیا کی تھی۔ اس واقعے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ فرقہ دارانہ اختلاف پر مبنی ہر قسم کا لٹریچر ناگی صاحب کے پاس نہ صرف موجود ہے، بلکہ وہ عندالطلب اس قسم کی ہر کتاب مہیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ دلچسپی رکھنے والوں کو خود ایسی کتب کے متعلق باخبر رکھتے تھے اور جس کتاب کو وہ خاصے کی چیز سمجھتے اس کے محاسن کو پرزور طریقے سے بیان کرتے اور زور دیتے کہ اس کا مطالعہ ہر حال میں ضروری ہے۔ نہ صرف کتب، بلکہ وہ بعض کتابوں کے خلاصہ جات، مختلف مضامین کی فوٹو کاپیاں بھی ہر وقت اپنے پاس رکھتے اور قدردانوں کو مفت تقسیم کرتے رہتے۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''اشراق'' کو نئے نئے قارئین تک پہنچانے میں ان کے انتھک دعوتی جذبے کو بہت دخل حاصل ہے۔ وہ ''اشراق'' کی کاپی نئے ملنے والوں کو تحفے میں دیتے اور اپنے پسندیدہ مضامین کی فوٹو کاپیاں بھی دعوتی مقاصد کے لیے تقسیم کرتے۔ ناگی صاحب ہی کی بدولت مجھے بھی تاریخی اعتبار سے بڑے معرکۃ الآرا موضوعات کی حقیقت جاننے کا موقع ملا۔ خاص طور پر انھوں نے سیرت النبی پر ایک ہندوستانی صاحب علم محمد عثمان قریشی کی کتاب ''سیرت دانائے سبل'' مجھے دی جو بلاشبہ بہت پائے کی کتاب تھی۔

ناگی صاحب کی شخصیت کا ایک زوردار پہلو لوگوں کے گمراہ خیالات کو پوری قوت سے سدھارنا تھا۔ اس حوالے سے وہ کسی مصلحت پسندی کے قائل نہ تھے۔ وہ آخری بات سے اپنی دعوت کا آغاز کرتے۔ خاص طور پر مشرکانہ عقائد رکھنے والے پر حجت تمام کرنا ان کی دعوتی دلچسپیوں کا محور ہوتا۔

وہ اپنے کاٹ دار دلائل سے بحث میں الجھنے والے مخالفین کو اکثر خاموش کرا دیتے اور پھر ایسے لوگوں کے پاس کئی دفعہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ وہ ان کو ذہنی یا جسمانی اذیت پہنچائیں۔ وہ جہاں گمراہ عقائد کے خلاف انتہائی سخت رویہ اپناتے، وہیں مخالفین کی مدد کرنے، ان کے مسائل حل کرنے میں کمربستہ رہتے۔ ان کے اس انسان دوست رویے نے کئی مخالفین کے دل جیتے اور وہ ان کی علمی ہدایت کا باعث بنے۔

دوسروں کی بے لوث خدمت، غمی خوشی میں شریک ہونے کی عادت اور بے پناہ محبت کی وجہ سے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ میری والدہ کی وفات پر وہ تعزیت کے لیے خود آئے تو میں بہت حیران ہوا، کیونکہ ایک ہفتہ پہلے جب میں ان کی تیمارداری کے لیے ان کے گھر گیا تو وہ ہوش میں بھی نہیں تھے۔ مجھے بعد میں ان کے بیٹے ابراہیم نے بتایا کہ وہ گھر والوں کو مطلع کیے بغیر ایک دوست کی گاڑی کے ذریعے سے آپ کے ہاں پہنچ گئے تھے۔

وہ نظریاتی اور تحریکی ہم آہنگی کو رشتے ناتے میں بدلنے کے بہت مؤید تھے۔ ان کا یہی جذبہ میرے چھوٹے بھائی

عدنان احمد کے سسر بننے کا باعث بنا۔ برادرم محمد بلال کے ساتھ اسی عزیز داری کی وجہ بھی ان کا یہی جذبہ تھا۔ ۲۸ اگست کو ان کے جنازے میں سبھی احباب موجود تھے۔ ہر کسی کے دل میں ان کے لیے یہی جذبات تھے کہ انھوں نے ایک غیرت مند مسلمان کی زندگی بسر کی۔ وہ اپنے احباب کے لیے خیر خواہی کا غیر معمولی جذبہ رکھتے تھے۔ سچ کو سچ کہنے اور غلط کو غلط کہنے پر انھیں کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ وہ عفوو درگزر کرنے میں بھی کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اللہ کے ولی تھے، ان کی تکلیف دہ علالت کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو اللہ نے اس بیماری کے ذریعے سے پاک صاف کر دیا تھا:

سبزۂ نورستہ اس گھر کی پاسبانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

کوکب شہزاد

ناگی صاحب

ناگی صاحب کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب سے المورد ادارۂ علم وتحقیق سے رشتہ قائم ہوا۔ مسلمان عورت اور مرد کے درمیان جو ایک جھجک اور رکھ رکھاؤ کا رشتہ ہوتا ہے وہ تو ہمارے درمیان تھا، مگر زندگی میں، میں جس شخص کے ایمان اور نیت کے صاف ہونے کی گواہی دے سکتی ہوں وہ ناگی صاحب تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتوں کے سایے میں رکھے۔

دین کی سربلندی کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہوئے پرخلوص ناگی صاحب اکثر مجھے فون کر کے ٹی وی پر آنے والے علما کے نظریات اور اسلوب گفتگو پر تنقید کرتے۔ دین کے بارے میں ان کی حمیت وغیرت اتنی زیادہ تھی کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر اذیت کے آثار ان کے چہرے پر دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کی لائبریری میں بہت قدیم اور نایاب کتابیں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر فوراً وہ کتابیں بھجوا دیتے، مگر واپس لینا کبھی نہ بھولتے۔ اگر ہم واپس کرنا بھول جاتے تو بڑی شایستگی سے یاددہانی کراتے۔

وہ ہر روپ میں ایک بہترین انسان تھے۔ میں نے ان کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ معاملہ کرتے دیکھا ہے۔ نہایت شفقت اور حکمت سے معاملات کرتے تھے خاص طور پر بیوی کے ساتھ ان کی بہت زیادہ، بلکہ قابل رشک حد تک ذہنی ہم آہنگی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بڑی بیٹی عائشہ مجھے بتا رہی تھی کہ اپنی بیماری کے آخری دنوں میں وہ بار بار اپنے رشتہ داروں سے یہ بات کہہ رہے تھے کہ عدت کے معاملے میں جو غلط فہمیاں ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں، ان میں ان کی بیوی کو پریشان نہ کیا جائے۔ کینسر جیسے موذی مرض کے بعد انسان نفسیاتی طور پر موت کو بہت قریب محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنی بیماری میں تقریباً ہر ہفتے مجھے فون کر کے ایک ہی بات کہتے تھے جو میں سمجھتی کہ ہمارے

لیے بڑی یاددہانی کی بات ہے کہ بہن، میرے ایمان کی سلامتی کی دعا کریں۔

وہ صبر و شکر کا پیکر تھے۔ دوسروں کے کام آنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اگر کوئی بیمار ہوتا تو فوراً کسی حکیم یا ڈاکٹر کا پتا بتا دیتے۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی اور ان کے علم میں یہ بات آ جاتی تو فوراً مدد کے لیے تیار ہوتے۔ ان کو دیکھ کر مجھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ قول یاد آتا تھا کہ ''مومن سانپ کی طرح ہوشیار اور کبوتر کی طرح معصوم ہوتا ہے۔'' یہ تحریر لکھتے ہوئے میرا دل نہ جانے کیوں مجھے بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ ان کے لیے ایسے الفاظ استعمال کروں جو کبھی بھی کسی عام انسان کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے۔ ناگی صاحب آپ کی استقامت اور ایمان کو سلام۔

سجاد خالد

ناگی صاحب

سرخ ٹینکی والی میلی سی سوزوکی موٹر سائیکل جس کے کیریئر کے ساتھ تالے والا ایک لوہے کا ڈبہ لگا ہوا ہے اپنے اسٹینڈ پر گم سم کھڑی ہے۔ اُس کے پاس سے مرد، عورتیں اور بچے آ جا رہے ہیں۔ ساڑھے تین فٹ چوڑی گلی میں کھڑی یہ لوگوں کے گزرنے میں ایک رکاوٹ ہی تو ہے۔ اگر اِس کا دل ہوتا تو درد سے پھٹ جاتا، آنکھیں ہوتیں تو روشنی کھو بیٹھتیں کہ یہ لوگ اُس کے ہم سفر اور سوار کی میت دیکھنے کے لئے گزر رہے ہیں۔

مجھے اس موٹر سائیکل کی آواز یاد ہے، اس کی چمک دمک اور مستعدی یاد ہے۔ اس کا سوار اپنی بیماری سے کہیں زیادہ اس کی خرابی کو ختم کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ وہ ایک عاشق تھا جس کا گھوڑا اُس کے محبوب سے ملاقات کے لیے بے حد اہم تھا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُسے کسی عالم دین سے عقیدت تھی، کچھ کے خیال میں وہ کسی مکتب فکر کا ترجمان تھا اور کچھ خیال کرتے تھے کہ وہ علم و تحقیق کا دلدادہ ہے۔ آخر کوئی شے تو تھی جو اُسے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ کوئی دُھن تو سمائی تھی جو ایک مستعد سواری کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔

اُس کا پورا وجود تہجد کے وقت جاگ جاتا تھا، محبوب سے تنہائی میں ملاقات کا یہ پہلا مرحلہ نماز فجر پر ختم ہوتا تھا۔ مسجد میں وہ پوری عاجزی کے ساتھ حاضر ہوتا۔ توحید اُس کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مطلوب دل ہزاروں برس کی دوری پر بھی پوری قوت کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔

اُس کی غیرت اپنے لیے نہیں خدا کے لیے ہر لحظہ میان سے نکلی ہوئی تلوار کی طرح تیار رہتی۔ یہ تلوار علم کا وار کرتی اور دلیل کی دھار سے کاٹتی ہے اخلاص اور کردار ڈھال اور زرہ کا کام کرتے تھے۔

وہ راتوں کا راہب، دِنوں کا سوار

انسان کو آئیڈیل بناتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان غلطی بھی کر سکتا ہے، انسان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اُس کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے، لیکن اصلاح صرف اُس کی ہو سکتی ہے جو اپنی راے اور عمل میں غلطی کے امکان کو مانتا ہو۔ میں بھی ناگی صاحب سے کبھی کبھی اختلاف کیا کرتا تھا۔ میں اُن سے کہتا کہ دیکھیں جو لوگ آپ کے نقطۂ نظر سے مختلف تصور دین رکھتے ہیں، اُنھیں آپ کی سرزنش کی نہیں محبت کی ضرورت ہے۔ میں اُنھیں دعوت دین کی حکمت عملی کی طرف متوجہ کرتا تو وہ میری بات پوری توجہ سے سنتے اور کہتے سجاد صاحب مجھ میں اتنی برداشت نہیں۔ وہ میری نیت پر شک نہیں کرتے تھے۔

وہ بتاتے تھے کہ انھوں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا تھا۔ والدہ بھی بچپن ہی میں شدید بیمار رہنے لگیں اور ہوش سنبھالا ہی تھا کہ انہیں اکیلا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ناگی صاحب اپنے ننھیال میں پلے اور کھیلنے کودنے کی عمر ہی میں زندگی کی تلخیوں سے واقف ہو گئے۔ ماں باپ کے بغیر اوروں کے رحم و کرم پر پلنے والے میں زندگی کی تلخی نے کہیں گھر کر لیا تھا۔ وہ ایک دواساز کمپنی میں ملازم ہوئے تو دین کے بارے میں اپنی راے کی بنیاد پر بہت سوں کو اپنا دشمن بنا بیٹھے۔ اپنی راے کے اظہار کی قیمت ایسے زخموں کی صورت میں دی جن سے اچھے اچھے جانبر نہیں ہوتے، لیکن دلیل کے بغیر راے نہیں بدلی۔

وہ اپنے خدا کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے اور خود کو محبت کی نہ ختم ہونے والی آزمایش میں دیکھتے تھے۔ اس آزمایش میں اُنھیں ہر رکاوٹ کو پھلانگنا تھا، ہر کوہ کو سر کرنا تھا، ہر وادی کی خاک چھاننی تھی۔

آپ بیمار ہیں تو ناگی صاحب ڈاکٹر بن جاتے ہیں، آپ کہیں جانا چاہتے ہیں اور جا نہیں پاتے تو ناگی صاحب ڈرائیور، آپ کے ہاں کوئی خوشی کا موقع ہو تو ناگی صاحب دوست، اور دکھ کے لمحے میں بہترین غم گسار۔ آپ کو پڑھنا ہے تو ناگی صاحب ضروری کتابوں اور رسالوں کے ساتھ حاضر۔ دوسروں کی خدمت پر آمادگی کی یہ ایک مثال تھی جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے۔

اُن کے چاہنے والوں کی لسٹ میں موٹر مکینک، حکیم، مولوی، ڈاکٹر، عالم، پروفیسر، صحافی، دکان دار اور ہر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوتے ... جب کسی کو ایک ایسا شخص میسر آ جائے جو اُس کی ہمیشہ خبر رکھے اور ہر ضرورت میں کام آنے کے لیے تیار رہتا ہو تو دل اپنے محسن کو یاد رکھنے لگتا ہے۔ ایسا شخص محبتوں کو سمیٹ کر رہتا ہے۔ کینسر کے تکلیف دہ اور جان لیوا مرض کے دوران میں اُن کی عیادت کرنے والوں کو دیکھا تو معلوم ہوا وہ صرف عاشق نہیں تھا محبوب بھی تھا۔ اُس کی شان محبوبی اُس کے عشق نے چھپا رکھی تھی۔

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

انسان مر جاتے ہیں لیکن کردار زندہ رہتے ہیں۔ تہجد کا وقت ایک پورے وجود کے ساتھ جاگ جانے والے کا منتظر ہے اور مسجد کی پہلی صف کسی کے قدم چومنے کو بے قرار ہے کہ یہ صرف پیروں کی میل سمیٹنے کے لئے نہیں بنی۔ وہ اپنے مزاج میں ملامتی صوفی بھی تھے اور مجاہد بھی۔ ناگی صاحب شہید بھی تھے کہ آخری دم تک شہادت حق دیتے رہے۔ سرخ رنگ کی میلی موٹر سائیکل اب کسی ایک اور ناگی صاحب کی راہ دیکھتی ہے۔

عقیل احمد انجم

میرے ہمدرد میرے دوست

اسحاق ناگی صاحب سے میرا پہلا تعارف ۱۹۹۵ء میں محمد بلال صاحب کے توسط سے ہوا۔ ''المورد'' کی طرف سے بلال صاحب ''اسلامی مرکز'' لاہور کے ناظم تھے، جس میں، میں ان کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہیں پر میری ناگی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میں ناگی صاحب کی بے تکلفی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے ساتھ ان کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ میرے کوئی بہت عزیز دوست ہوں۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے ان کے گھر پر ناگی صاحب ہی نے مجھے متعارف کرایا، جو ان کا مجھ پر ایک عظیم احسان ہے۔ اس کے بعد بھی میں وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ اصلاحی صاحب سے ملنے جاتا رہا۔

ناگی صاحب کی بعض مقدس لوگوں پر تنقیدوں سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی، میں گلہ کرتا تو وہ مجھے گھنٹوں سمجھاتے کبھی میں ان کی بات مان لیتا اور کبھی رد کر دیتا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ساری باتیں میری سمجھ میں آتی گئیں اور ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔

ان کی طبیعت کا ایک پہلو طب کے ساتھ دل چسپی بھی تھا۔ خاص طور پر مرضِ گردہ کے لیے انھوں نے ایک خاص دوا بنائی ہوئی تھی جو وہ مریضوں میں مفت تقسیم کرتے۔ ۲۰۰۷ء میں میرے گردے میں پتھریاں بن گئیں۔ میں نے ان سے بات کی تو وہ بے چین ہو گئے اور دوسرے دن صبح صبح میرے گھر پہنچ گئے اور مجھے لے کر ایک حکیم صاحب کے پاس آ گئے۔ میں نے کہا: ناگی صاحب مجھے حکیموں پر اعتبار نہیں ہے تو وہ مجھے فوراً جنرل ہسپتال اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس لے گئے اور میرا مکمل چیک اپ کرایا۔ اس کے بعد بھی وہ فون پر گاہے گاہے پوچھتے رہتے۔ اور جب میں نے ان کو بتایا کہ میرے گردہ سے پتھریاں نکل گئی ہیں تو انھوں نے کہا اللہ بہت کریم ہے اس کا شکر ادا کرو۔

ماہنامہ ''اشراق'' کی ترسیل میرے پاس تھی اور وہ مجھ سے ہر مہینے تقریباً ۱۰۰ ''اشراق'' لے کر دعوتی مقاصد کے لیے لاہور کے مختلف علاقوں میں تقسیم کرتے تھے۔

ناگی صاحب نے ہمیشہ جدوجہد سے بھرپور زندگی بسر کی اور کبھی ہار نہیں مانی۔ مگر آخری وقت میں وہ اس بیماری کے ہاتھوں ہار گئے، لیکن انھوں نے اپنے رب سے اس کا کبھی بھی گلہ نہیں کیا۔ سخت بیماری اور تکلیف میں بھی صرف اس کا شکر ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کا خادم بن کر گزاری اور وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے تھے۔ زندگی کی آزمایش میں انھوں نے ہر رکاوٹ کو پار کیا اور ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ وہ آج ہم میں موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی یادیں اور ان کا اللہ کی رضا کے لیے کیا ہوا کام ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

محمد عدنان قیصرانی

محترم محمد اسحاق ناگی مرحوم ایک جہد مسلسل

اسحاق ناگی صاحب سے میرا تعلق چند برسوں پر محیط تھا۔ان سے فون پر مختلف علمی و معاشرتی مسائل پر گھنٹوں باتیں ہوتیں، کچھ باتوں میں وہ میری رہنمائی کرتے تو کچھ میں ہم نوائی۔

وہ ہمت و حوصلہ کے کوہ گراں تھے۔ وہ محبت و شفقت کا تناور درخت تھے۔ وہ تکلیف کے اس عالم میں جب شریک گفتگو ہوتے تو میں ان سے بہت کچھ سیکھتا اور اس دوران میں میری آنکھوں سے آنسو بھی گرتے رہتے۔ قابل رشک تھا ان کا دعوتی جذبہ۔انھوں نے اللہ کے نام کی سربلندی کے لیے ہر تکلیف کو پس پشت ڈال دیا تھا۔توحید کے معاملے میں وہ مانند فولاد تھے۔اس معاملے میں وہ نہایت حساس اور سخت واقع ہوئے تھے۔ایک مرتبہ ان کے محلے میں جعلی عامل بابا نے ڈیرے ڈالے۔ وہ شخص لوگوں کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا سبب بن رہا تھا۔انھیں یہ بات کہاں گوارا تھی۔انھوں نے اس شخص کو اپنی جرأت استدلال سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

ان کی طبیعت کا ایک اور پہلو طب سے دل چسپی کا بھی تھا۔ درد گردہ اور گردہ کی پتھری کے لیے انھوں نے ایک سفوف تیار کر رکھا تھا۔جس سے بہت سے لوگ شفایاب بھی ہو چکے تھے۔ یہ دوا لوگوں کو وہ بلا معاوضہ فراہم کرتے۔ خود کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ دوسروں کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

کچھ تاریخی واقعات و معاملات کے بارے میں ان کا موقف نہایت بے لچک اور سخت ہوا کرتا تھا۔ وہ نیک نیتی سے سمجھتے تھے کہ ان معاملات میں ان کے مخاطبین کا موقف دلائل سے خالی ہے،لیکن کسی بھی حال میں وہ تشدد کے قائل نہ تھے۔فرقہ پرستی کا ناسور ان کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ ہمیشہ پر امن اور مدلل انداز میں گفتگو کرتے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد صاحب غامدی سے ان کی والہانہ محبت ان کی باتوں سے جھلکتی تھی۔

مولانا وحیدالدین خان کو وہ سچا داعی سمجھتے تھے۔

کینسر کی وجہ سے شدت تکلیف اس قدر تھی کہ ان سے بولا اور اٹھا بھی نہ جاتا تھا، لیکن ان کا دعوتی جذبہ ملاحظہ ہو کہ اس حال میں بھی ہسپتال جاتے تو دعوتی لٹریچر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور لوگوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔

ناگی صاحب نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کا خادم بن کر گزاری۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کبھی مایوس نہیں کرتا۔ اسحاق ناگی ایک جذبہ، جنوں اور دعوت کا نام ہے۔ یہ دعوت اللہ کی طرف بلانے کی دعوت ہے۔ جو لوگ اللہ کی دعوت کا کام کرتے ہیں اللہ پاک ان کو امر کر دیتے ہیں۔ وہ یقیناً اپنے بچوں کی تو خوب تربیت کر گئے ہوں گے لیکن ہم جیسے طالب علموں کو یتیم کر گئے ہیں۔ وہ درخشندہ ستارے کی مانند ہمارے دل و دماغ میں روشن رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

ابراہیم ناگی

باپ بیٹا

اسحاق ناگی صاحب میرے والد بھی تھے اور دوست بھی۔ گھر میں، میں سب سے چھوٹا اور اکلوتا بھی ہوں۔ میری پیدایش چھ بہنوں کے بعد ہوئی۔ ابا بتاتے ہیں کہ جب میری پیدایش ہوئی تو ان کی خوشی کی انتہا نہ تھی، انھوں نے میری تصویر کے عید کارڈ بنا کر لوگوں میں تقسیم کیے۔ میری پیدایش سے پہلے لوگ کہتے تھے کہ تم کسی مزار پر جاؤ گے تو ہی تمھارے ہاں بیٹا پیدا ہو گا، مگر ابا اس کے سخت خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ مجھے چھ بیٹیوں کے بعد بیٹا دے گا۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ کوئی شخص اگر تین بیٹیوں کی کفالت کرتا ہے تو اللہ اُس کو جنت میں جگہ دے گا۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں دو جنتیں لوں گا اور ایسا ہی ہوا۔ چھ بیٹیوں کے بعد میری پیدایش ہوئی، جن میں سے دو کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ میری پیدایش کے بعد ایک بیٹا اور پیدا ہوا، لیکن اس کا بھی تین ماہ کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو ابا گلیکسو (Glaxo) میں نوکری کرتے تھے۔ ابا کا دن تہجد کے وقت سے شروع ہو جاتا تھا۔ تہجد پڑھنے کے بعد فجر کی اذان شروع ہوتے ہی سب گھر والوں کو بھی نماز کے لیے اٹھا دیتے۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا نماز کے معاملے میں انھوں نے سختی شروع کر دی۔ وہ کبھی پیار سے اور کبھی غصے سے نماز کے لیے اٹھاتے تھے۔ آہستہ آہستہ میری نماز پڑھنے کی عادت پختہ ہو گئی۔ ابا کو قرآن کا زیادہ تر حصہ زبانی یاد تھا خاص طور پر توحید کے حوالے سے سورتیں زیادہ یاد تھیں۔ انھوں نے مجھے بھی چھوٹی چھوٹی دعائیں اور سورتیں یاد کرانا شروع کر دیں۔ اس طرح مجھے بھی بہت سی سورتیں یاد ہو گئیں۔

ابا نماز مسجد میں ہی ادا کرتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ سردیوں میں چونکہ دن چھوٹے ہوتے ہیں، اس لیے نماز کا وقت جلدی ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد گھر روانہ ہونے کو تھے۔ میں نے کہا:

بابا یہیں رہتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہی دوسری نماز کے لیے پھر آنا پڑے گا۔ بابا نے میری اس معصومیت پر میرا منہ چوما اور کہا: بیٹا کوئی بات نہیں پھر آ جائیں گے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے اور میری ہر خواہش پوری کرنے کی پوری کوشش کرتے۔

ابا کی پیدایش کامونکی میں ہوئی تھی۔ تین سال کی عمر میں وہ کراچی شفٹ ہو گئے۔ چھ سال کی عمر میں، ان کی والدہ نے تعلیم کی غرض سے انھیں لاہور بھجوا دیا۔ جب اُن کی والدہ کا انتقال ہوا تب وہ چوتھی جماعت کے طالب علم تھے۔ لاہور میں وہ رشتہ داروں کے ہاں پلے بڑھے۔ وہ ذہین طالب علم تھے۔ کلاس میں ہمیشہ اوّل پوزیشن لیتے۔ پرائمری، مڈل اور میٹرک تک وظیفہ لیتے رہے۔ ان کی آگے پڑھنے کی خواہش تھی، مگر والدین سر پر نہیں تھے اس لیے یہ خواہش حسرت ہی بنی رہی۔

ابا کی پہلی نوکری میں اُنھیں ایک اسکول کی تعمیر کا کام کرنا تھا۔ اس کے بعد ابا نے ایک دو اور جگہوں پر ملازمت کی۔ وہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں محاذ پر بھی گئے۔ سیون اپ (7up) فیکٹری میں بھی نوکری کی۔ ۱۹۷۴ء میں شادی ہوئی۔ اس کے بعد گلیکسو (Glaxo) میں ملازمت اختیار کر لی۔

ابا کہتے تھے کہ میں شادی کے بعد مسلمان ہوا (یعنی شعوری مسلمان)۔ وہ کچھ عرصہ جماعت اسلامی کے ساتھ بھی رہے۔ پھر غالباً ستر کے عشرے میں ان کی ملاقات جناب جاوید احمد صاحب غامدی سے ہوئی۔ غامدی صاحب کے توسط سے ان کی ملاقات مولانا امین احسن صاحب اصلاحی سے ہوئی۔ وہ اصلاحی صاحب کے دروس میں باقاعدگی کے ساتھ جانے لگے۔ اور اُن سے بہت متاثر ہوئے۔ اُن کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ خود کتابیں خریدتے اور دوسروں کو بھی اس سے مستفید کرتے۔ مسلمانوں کی تاریخ پر اُن کی بہت تحقیق تھی۔ مگر ان کی ذاتی لائبریری میں دوسرے موضوعات پر بھی ہزاروں کتب موجود ہیں۔

مولانا اصلاحی جب بہت بیمار تھے تو ابا اپنے چند احباب کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے گئے تو مولانا سے ایک سوال پوچھا: مولانا آپ تکلیف میں کیا محسوس کرتے ہیں؟ مولانا نے جواب دیا: دنیا کی تکلیف آخرت کی تکلیف سے کہیں بہتر ہے۔ مولانا کی وفات پر ان کی قبر کی پیمایش کرنا مشکل تھی، چونکہ ابا کی جسامت مولانا کے مشابہ تھی اس لیے ابا ان کی قبر میں پہلے خود لیٹے اور سائز کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔

توحید کے معاملے میں وہ بہت سخت تھے۔ اللہ کے سوا کسی اور سے مدد طلب کے سخت خلاف تھے۔ بعض لوگوں کو ان کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس بنا پر گلیکسو میں ایک شخص نے ابا کو قینچی ماردی جو ان کے پیٹ میں جا لگی جس

سے ان کا جگر اور سانس کی نالی کٹ گئی۔ ان کا بہت سا خون بہ گیا۔ اس شخص کو گلیکسو (Glaxo) نے نوکری سے نکال دیا اور جیل بھی بھجوا دیا، جب وہ صحت یاب ہوئے تو انھوں نے اس شخص کو جیل سے رہا بھی کرایا اور دوبارہ نوکری پر بحال بھی۔ ابا مزاج کے تھوڑے سخت ضرور تھے مگر دل کے بہت نرم تھے۔ وہ کسی کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے اور ممکن حد تک اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ ہر وقت خدا کے دین کے لیے سرگرم رہتے۔ ہم سب کا ان سے ایک ہی اختلاف تھا کہ اپنے لیے بھی کچھ وقت نکالا کریں اور اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں، مگر وہ نہیں سنتے تھے۔ کہتے: جب تک زندگی ہے، خدا کی بندگی اور اس کے بندوں کی خدمت کی جائے۔ وہ رات کے سوا بستر پر نہیں لیٹتے تھے۔ تقریباً بارہ سال پہلے وہ ایک حادثے کا شکار ہوئے، جس میں انھیں آگ لگ گئی اور ان کی موٹر سائیکل بھی مکمل تباہ ہوگئی۔ تب وہ ایک ماہ تک بستر پر رہے۔ اس کے بعد پھر اسی طرح اپنی خدمات انجام دینے لگے۔

۲۰۰۶ء میں انھیں پراسٹیٹ (prostate) کا مسئلہ ہوا۔ چونکہ وہ طب کا بھی تھوڑا بہت علم رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے خود اپنا علاج کیا اور ٹھیک ہو گئے۔ ۱۵ نومبر ۲۰۱۰ کو انھیں یہ تکلیف دوبارہ شروع ہوگئی، جو ٹھیک نہ ہوسکی۔ جس سے ان کے گردے متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ دونوں گردوں اور مثانے میں یورین بیگ (urine bag) لگانا پڑے۔ اس دوران میں تقریباً وہ دو ماہ ہسپتال رہے۔ تب ڈاکٹرز نے تشخیص کی کہ انھیں پراسٹیٹ کینسر (prostate cancer) ہے۔ جس کے لیے ہمیں شوکت خانم کینسر ہسپتال سے رجوع کرنا پڑا۔ تین ماہ تک ان کے تینوں بیگ اتر گئے اور کچھ ہفتوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے اور موٹر سائیکل بھی چلانے لگے۔ چونکہ مرض اپنی جگہ پر موجود تھا اور علاج بھی جاری تھا، اس لیے ڈاکٹرز نے انھیں کیموتھراپی کے لیے کہا۔ شروع میں تقریباً ان کی طبیعت ٹھیک رہی۔ لیکن تیسری، چوتھی کیموتھراپی کے بعد ان کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی۔ تب تک مرض شدت اختیار کر چکا تھا۔ پانچویں کیموتھراپی کے بعد ابا نے کیمو لگوانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ انتہائی تکلیف دہ عمل تھا۔ کیمو کے دوران میں ابا کی جو حالت ہوتی وہ ہم گھر والوں سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ شب و روز درد سے چیختے اور روتے تھے۔ اور بہت چڑ چڑے ہو گئے تھے۔ وہ خود اپنے لیے خدا سے صحت کی دعائیں مانگتے اور ہمیں بھی اس کے لیے کہتے۔

وہ ہمیشہ ہمیں نصیحت کرتے کہ کبھی خدا کے سوا کسی اور کو نہ پکارنا۔ خدا سے تو ان کا ایک خاص تعلق تھا۔ وہ کہتے: مجھے کبھی اُس سے مانگ کر مایوسی نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ بیماری بہت شدید ہو چکی تھی، اور شاید اس طرح بیماری مزید کچھ عرصہ انھیں تکلیف میں رکھتی، ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ایک حادثے میں

ان کے سر پر چوٹ لگ گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے خون دماغ میں جم گیا۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر غنودگی میں رہنے لگے تھے۔ غنودگی سے پہلے اور غنودگی کے بعد جب بھی ہسپتال جاتے تو کچھ کتابیں ساتھ لے جاتے۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں میں وہ کتابیں تقسیم کرتے۔ اور ان کو توحید کی دعوت دیتے۔ یہ کام وہ آخری دم تک کرتے رہے۔

۱۹ اگست ۲۰۱۲ کو ان کی طبیعت زیادہ خراب ہونے کی صورت میں ہم انھیں ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال میں پانچ دن بعد ٹیسٹوں کے نتائج کی روشنی میں ڈاکٹرز نے بتایا کہ یہ کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔ آپ جب تک چاہیں انھیں ہمارے ہاں رکھ سکتے ہیں۔ مگر ان کا آخری وقت اپنے لوگوں میں گزرے تو بہتر ہے۔ وفات سے ایک دن پہلے وہ Fits کے مسئلے کا شکار ہو گئے۔ اس آخری رات میں ان کے ساتھ ہی لیٹا تھا۔ جیسے ہی Fits کا مسئلہ ہوتا، میں فوراً اُٹھ جاتا۔ میں نے ان کے کان میں کلمہ پڑھا اور اللہ اکبر کا ورد کرنا شروع کیا۔ جیسے ہی میں نے یہ کلمہ پڑھنا بند کیا، ان کا سانس رکنا شروع ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ ابا کی تربیت تھی کہ گھر والے غم زدہ ہونے کے باوجود خدا کی رضا پر راضی تھے۔ سکینت کی سی کیفیت تھی۔ ہر آنے والا شخص اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اُن کی زندگی واقعی ایک مومن کی زندگی تھی۔ مختلف لوگ مختلف باتیں کر رہے تھے: ناگی صاحب نے میری فلاں مشکل میں مدد کی، انھوں نے ہمارا فلاں مسئلہ حل کرایا، میرا فلاں مرض ان کی وجہ سے ٹھیک ہوا۔ آج اگر میری زندگی ہے تو ان کی وجہ سے۔ آج اگر میں مسلمان ہوں تو ان کے باعث....تو دل کو مزید اطمینان ہوا۔ میں اللہ تعالیٰ کا بہت شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے اپنے والد کی خدمت کی توفیق دی۔

عائشہ بلال

میرے بہترین دوست

عام طور پر بیٹیاں اپنی ماؤں سے دل کی باتیں کرتی ہیں، وہ اپنی ماں کو اپنا دوست بناتی ہیں، مگر میرے دوست میرے بابا تھے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ میرے بہترین دوست تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ میں جب بھی کسی پریشانی میں مبتلا ہوتی تو وہ میرا چہرا دیکھ کر ہی میرے دل کا حال محسوس کر لیتے تھے۔ میں ان کے ساتھ اپنے مسائل شیئر کر کے دل کا غبار نکال لیا کرتی تھی، جس سے میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ جایا کرتے تھے، بعض اوقات وہ مسئلہ جوں کا توں موجود رہتا تھا، مگر میں پُرسکون ہو چکی ہوتی تھی۔ وہ مجھے سوچ کا ایسا زاویہ دے دیا کرتے تھے کہ مسئلہ اپنی شدت کھو دیتا تھا۔ اس صورت حال میں وہ مجھے بہت قیمتی مشورے دیتے تھے۔ ان مشوروں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ثمرات صرف اس دنیا تک محدود نہیں ہوتے تھے بلکہ آخرت کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے میرے ساتھ بہت بدتمیزی کی، انسانی لحاظ سے میں بہت غصے میں تھی اور انتقامی نفسیات میں مبتلا تھی۔ بابا کو ملی۔ انھوں نے عجیب سا مشورہ دیا۔ کہا: اگر تم اس کا بہترین بدلہ لینا چاہتی ہو تو اسے آخرت پر چھوڑ دو۔ اللہ تمھاری طرف سے بدلہ لے گا۔ ایسے ہی کئی مسائل میں وہ دوسرے فریق کو نظر انداز کر کے مجھے اپنی اصلاح کرنے پر زور دیتے تھے۔ مجھے ایثار، قربانی اور درگزر کی نصیحت کرتے تھے۔ ایسے باپ، ایسے دوست، اس دنیا میں کہاں ہوتے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خصوصی فیضان تھا جو ہماری خوش نصیبی کے باعث ہمیں میسر تھا۔

تم سے دوری کا احساس ستانے لگا
تیرے ساتھ گزارا ہر لمحہ یاد آنے لگا

مجھے یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ اپنی اولاد میں انھوں نے سب سے زیادہ میری علمی و دینی تربیت کا خصوصی اہتمام

کیا۔ انھوں نے مجھے محترم جاوید احمد صاحب غامدی کے شاگرد اور اپنے دوست محمد رفیع مفتی صاحب کی باقاعدہ شاگردی میں دیا۔ رفیع صاحب سے میں نے عربی زبان اور دیگر علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح وہ مجھے غامدی صاحب کے دروس اور لیکچرز کے علاوہ ان کے گھر بھی باقاعدگی سے لے کر جاتے تھے جس سے غامدی صاحب کے گھر کی خواتین کے ساتھ بھی میرے تعلقات قائم ہو گئے جو میرے لیے ایک اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میرے بابا کی محبت میں بڑی شدت ہوتی تھی۔ بچپن میں وہ میرے کپڑے بھی استری کیا کرتے تھے۔ میں شادی کے بعد جب گھر جاتی تو وہ مجھے بچوں کی طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتے۔ چند دنوں کے بعد بھی ملتی تو ایسے ملتے جیسے میں برسوں کے بعد ملی ہوں۔ موبائل پر مسلسل رابطہ رکھتے۔ انھوں نے ہمیں تاکید کر رکھی تھی کہ ہم بیٹیاں بھی اسی کمپنی کی موبائل سروس استعمال کریں جس کی وہ کرتے ہیں تاکہ کم سے کم خرچ میں باہمی رابطہ زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

دعا ہے کہ آخرت میں بھی ہمیں ان کی محبت اور صحبت میسر ہو اور وہاں بھی وہ ہمیں ایسے ہی ملیں اور ایسے ہی رابطے میں رہیں۔

مریم اسحاق

ہمارے بابا

میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ.... مجھے سب سے زیادہ پیار کرنے والی ہستی ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گئی۔ جدائی میں اگرچہ آنکھیں نم اور دل اداس ہے مگر حکم خداوندی کے آگے سر تسلیم خم ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سراپا محبت..... انتہائی شفقت کرنے والے بابا جانی..... ہم بچوں میں زیر بحث ہے کہ بابا سب سے زیادہ مجھے پیار کرتے تھے...... جی نہیں، مجھے..... فلاں بات صرف مجھے اور بابا ہی کو پتا تھی..... اچھا تو فلاں بات آپ کو نہیں پتا تھی نا..... پتا تھی، مگر پہلے تو بابا نے مجھے بتائی تھی نا..... جو بھی ہے مجھے وہ سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ سب سے زیادہ میری فکر کرتے، سب سے چھپا کر مجھے بہت کچھ لے کر دیتے اور میرے لیے تو اللہ تعالیٰ سے خاص دعائیں کرتے۔

وہ خود تو جدا ہو گئے مگر ان کی محبتیں اور یادیں کبھی جدا نہ ہوں گی، ہم ایک بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ سب کی بابا سے اور بابا کی سب سے بے انتہا محبت تھی۔ بیٹیاں روز بھی آتیں تو والہانہ استقبال کرتے۔ بازو پھیلا کر کھڑے ہو جاتے: میرا شہزادہ آیا۔ ماتھا چومتے، سینے سے لگاتے، دعائیں دیتے۔ وہ جتنے دن دور رہیں، ان دنوں کی ساری باتیں پوچھتے۔ جاتے وقت یوں رخصت کرتے جیسے کئی برسوں بعد آنا ہو۔ ہماری کسی خطا پر ڈانٹ دیتے تو بہت پچھتاتے۔ پھر گود میں بٹھا کر پیار کرتے۔ بہت سوں نے تو بیٹیوں سے پیار کرنا بابا سے سیکھا۔ اسی طرح سبھی دامادوں کو بہت عزت دیتے تھے۔

تہجد میں گھر والوں کے لیے خصوصی دعائیں کرتے، سب پر کلام الٰہی پھونکتے اور کہتے: اٹھو اللہ تم پر رحم کرے، نہ جانے اس پھونک میں کیا ٹھنڈک اور برکت تھی کہ فوراً آنکھ کھل جاتی۔ وہ تکلیف کے دوران میں سبھی نمازیں ادا کرتے، مگر تہجد کی باقاعدگی نہ رہی تھی۔

ایک دن میں نے کہا: آپ پھونک مار دیا کرتے تھے تو آرام سے دن گزر جاتا تھا اب تو کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا! وہ اسی تکلیف میں دعائیں کرتے رہے پھر مجھ پر پھونک مار کر بولے: شہزادے میں نے تم پر ساری زندگی کی پھونک ماردی، اللہ تم پر اپنا خاص کرم رکھے! اس کے بعد پریشانی میں بھی پہلے جیسی بے قراری نہ رہی۔

بچپن میں مجھے ایک زخم لگ گیا۔ ان کے حوصلے، ہمت اور شفقت نے کبھی درد محسوس ہی نہ ہونے دیا۔ میری بنائی ہوئی چیزیں (ہینڈی کرافٹ) دوسروں کو بڑے شوق سے دکھاتے۔ بڑے فخر سے بتاتے میری بیٹی فلاں کلاس میں ہوگئی ہیں۔ اکثر مبالغہ آرائی کر جاتے، حالانکہ میں اس قابل نہیں تھی جتنا وہ مجھ پر فخر کرتے۔

امی کے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے تھے، بہت خیال رکھتے، ہر جگہ ساتھ لے کر جاتے۔ کہیں امی اکیلی چلی جاتیں تو ہمیں فون کر کر کے پوچھتے میری اکلوتی بیگم آ گئی ہے؟ یہی محبت تھی کہ جب بابا کو ان کی آخری آرام گاہ کی طرف لے جانے لگے تو خواتین رسماً بین کرنے لگیں تو ماں نے بلند آواز سے کہا: خبردار کسی عورت کا غم مجھ سے بڑا نہیں، کوئی آواز نہ آئے۔ میں نے ان کو اللہ کے سپرد کر دیا!

نواسیوں نواسوں سے تو ان کی محبت سب سے بڑھ کر تھی۔ تکلیف میں بھی پیٹ پر بٹھا کر کہانیاں سناتے۔ بچوں کی منی شاپ گھر پر ہی بنا رکھی تھی، اس میں کینڈیز، بسکٹ، چپس ختم نہ ہونے دیتے، خاص کر اسد اللہ کو بڑھتا دیکھتے ہوئے بہت دعائیں کرتے۔ حج سے آئے تو اسد سے کہا: اللہ نے چاہا تو اگلے سال میں اور آپ حج پر چلیں گے۔

ان سے دشمنی رکھنے والا کوئی نہیں تھا سوائے اس کینسر کے جس نے بابا کو ہم سے جدا کر دیا، ہاں اختلاف رکھنے والے بہت تھے جو دلیل میں مات کھا چکے تھے۔ تعزیت کرنے والوں میں ہر فرد کی زبان پر یہی الفاظ تھے ناگی صاحب نے ہمارے ساتھ بہت بھلائی کی۔ انھوں نے اتنی ہمدردیاں، خلوص اور محبتیں بانٹیں کہ بولنے والوں نے بول کر، لکھنے والوں نے لکھ کر ان کی خیر خواہی کی گواہی دی۔ حقوق العباد کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کے معاملے میں بھی بہت حساس تھے۔ ان کا اللہ سے تعلق، تکلفات سے پاک تھا۔ ہم تو ادب و آداب میں پڑ کر بہت سے موقعوں پر ضرورت کے باوجود اللہ کو یاد نہیں کرتے۔ عالم کے پروردگار سے تو خود ان کی بہت اچھی دوستی تھی۔ امید ہے وہ اپنے دوست کو ضرور اپنی جناب میں خاص جگہ دے گا۔

مرتب: منظور الحسن

محمد اسحاق ناگی

[۲۰۰۰ء میں اسحاق ناگی صاحب کا اشراق دعوۃ کے لیے کیا گیا ایک یادگار انٹرویو]

جناب جاوید احمد غامدی نے دعوت دین کے کام کو منظّم کرنے کے لیے ''دانش سرا'' کا ادارہ ۱۹۹۷ء میں قائم کیا۔ اس ادارے کے قیام سے برسوں پہلے جناب محمد اسحاق ناگی نے دعوت کے میدان میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور پوری تن دہی کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔ غامدی صاحب ان کو اس حلقۂ فکر کا پہلا داعی کہتے ہیں۔ اس میدان میں ان کی مساعی کا تسلسل ۲۰ سال سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ لیکن اس پورے زمانے میں شاید کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہو گا جس میں وہ دعوت، اہل دعوت اور مخاطبین دعوت سے غافل رہے ہوں۔ ان کی دعوت کا موضوع بالعموم توحید اور تذکیر آخرت رہا ہے۔ ''المورد'' میں حدیث کے استاد جناب محمد رفیع مفتی، ''اشراق'' کے نائب مدیر جناب محمد بلال اور دانش سرا کے سرگرم رفیق جناب لیاقت علی انھی کی دعوت اور کاوشوں سے اس حلقے میں شامل ہوئے ہیں۔

ناگی صاحب ۲۵ دسمبر ۱۹۵۰ کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کینٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ نوعمری ہی میں دین سے تعلق پیدا ہو گیا۔ یہ تعلق اتنا بڑھا کہ اس کے بعد کوئی اور تعلق باقی ہی نہیں رہا۔ کچھ عرصہ تنظیم ''خدام القران'' سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۵ء میں غامدی صاحب سے درس قرآن کے ذریعے سے تعارف ہوا۔ ان کے نقطۂ نظر کے قائل ہو گئے اور دعوت دین کے کام میں ان کے رفیق بن گئے۔ اور اب تک یہ رفاقت پوری شان کے ساتھ قائم ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے بھی بے پناہ محبت کا تعلق رہا۔ خود مولانا اصلاحی بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔

ناگی صاحب کی روزمرہ کی مصروفیات، اپنے گھر پر اہل علم کی نشستوں کا انعقاد، جاوید صاحب کے دروس میں لوگوں کی شرکت کا اہتمام، ''اشراق''، مطبوعات دانش سرا اور آڈیو لیکچرز سے لوگوں کا تعارف، قرآن مجید اور دینی کتب کا مطالعہ اور دعوتی ملاقاتیں ہیں۔ امام حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا وحید الدین خاں اور جناب جاوید احمد غامدی سے متاثر ہیں۔ کتب و جرائد کے حوالے سے ''تدبر قرآن''، ''خطبات''، ''اللہ اکبر''، ''مطالعۂ تصوف، قرآن و سنت کی روشنی میں''، ''خلافت معاویہ و یزید''، ''اشراق'' سے متاثر ہیں۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ دانش سرا کے کاموں سے کن پہلوؤں سے اختلاف رکھتے ہیں تو انھوں نے کہا: ''انسان کو اپنی غلطیاں بالعموم نظر نہیں آتیں، اس بارے میں کوئی بات کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' اس سوال کے جواب میں کہ آپ دعوت کا کام کرتے ہوئے کن لوگوں کو مخاطب بناتے ہیں اور کیا طریق کار اختیار کرتے ہیں، انھوں نے کہا: ''میں بالعموم ان افراد کو دعوت کا مخاطب بناتا ہوں جو پہلے سے دینی زندگی تو اختیار کیے ہوتے ہیں یا دین کے بارے میں مثبت رجحان تو رکھتے ہیں، مگر دین کی صحیح تعبیرات سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے فکری انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے محض زاویۂ نظر کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ دین کے صحیح فکر کے حامل بن جاتے ہیں۔ جہاں تک طریق کار کا تعلق ہے تو وہ افراد کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ کسی کو درس میں مدعو کر کے، کسی کو ''اشراق'' کا قاری بنا کر، کسی کو کیسٹ سنا کر اور کسی کو اپنے حلقے کے اہل علم سے ملوا کر دین کا پیغام پہنچاتا ہوں۔ لیکن اس ضمن میں جس بات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، وہ ذاتی تعلق ہے۔ اگر آپ اپنے مخاطبین سے ذاتی تعلق قائم کرتے ہیں، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، تو آپ کا مخاطب آپ کی بات کو پورے خلوص کے ساتھ سنے گا۔''

محمد بلال

''اپر کلاس'' کی باتیں

[ماہنامہ ''اشراق'' جنوری ۱۹۹۹ میں محمد اسحاق ناگی مرحوم پر ایک تحریر لکھی تھی۔ ان کی یاد میں اپنی یہ پرانی تحریر نذر قارئین کر رہا ہوں، جو آج بھی تازہ لگتی ہے، اِس یقین کے ساتھ کہ آج وہ عالم برزخ کی بھی ''اپر کلاس'' میں اپنی دوسری زندگی بسر کر رہے ہیں۔]

پچھلے دنوں میرا گیارہ ماہ کا پہلا اور اکلوتا برخوردار اسد اللہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ وہ واکر (walker) سمیت ۱۶ زینوں کی سیڑھی سے گر گیا۔ میں دفتر میں تھا۔ خبر ملتے ہی میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پریشانی کے عالم میں تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر پہنچا۔ اسد گم سم لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ کے قریب چوٹ لگی ہوئی تھی، جسے دیکھتے ہی میرے دل کو چوٹ لگی۔ اس کا سہما ہوا چہرہ مجھے طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے اسے گود میں لے کر اس کا دل لبھانے کی کوشش کی۔ جس چیز سے وہ خوش ہوتا تھا، وہ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ جن باتوں سے وہ خوش ہوتا تھا، وہ باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، لیکن اس کی شخصیت اپنی روایتی چہچہاہٹ سے تا حال محروم تھی۔ یکا یک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اسد کو اپنے نانا (اسحاق ناگی صاحب) سے اور نانا کو اپنے اس اکلوتے نواسے سے بڑی محبت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی صحبت سے خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ اسد کے نزدیک ناگی صاحب کی داڑھی کی حیثیت ایک کھلونے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ وہ بڑی مہارت سے ان کی گھنی داڑھی کا ایک بال پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اکھیڑ دیتا ہے اور ناگی صاحب جیسے مرد آزما کو چیخ مارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور نانا بھی ایسے ہیں جو اس تکلیف سے لذت اٹھاتے ہیں اور ایک مزے دار حکایت کی

طرح یہ بات دوسروں کو سناتے ہیں۔

ہم ناگی صاحب کے گھر آ گئے۔ انھوں نے حادثے کی تفصیل سن کر کہا: اللہ کا شکر ہے۔ اتنے زینوں والی سیڑھی سے گرنے کے بعد یہ (معمولی) چوٹ آئی ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ صدقہ خیرات کریں۔ شکرانے کے نوافل ادا کریں۔ اللہ نے اسے دوسری زندگی دی ہے۔ ناگی صاحب کی بات سن کر میری اندرونی کیفیت فوراً بدل گئی۔ یکا یک میرے اندر شکر خداوندی کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ خدا کی طرف دھیان گیا تو ڈوبتے ہوئے دل کی دھڑکنیں پھر سے بحال ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اسد کی چہچہاہٹ لوٹ آئی۔

ناگی صاحب کی بات میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں زحمت میں رحمت دیکھنے کی شعوری کوشش کرتا ہوں۔ موسیٰ و خضر کا واقعہ بالعموم پیش نظر رکھتا ہوں اور عیب دار کشتی میں ایک محفوظ کشتی دیکھتا ہوں۔ لیکن صدمے کی کیفیت نے مجھے اپنا ہی ایک زاویۂ نگاہ بھلا دیا تھا۔ اُس وقت ناگی صاحب نے دراصل میرے لیے ایک مذکر کا کام کیا۔ یعنی ایک مانی ہوئی لیکن بھولی ہوئی بات کی یاددہانی کا کام۔

دینی معلومات رکھنے والے بعض لوگ دینی مجالس میں شریک نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ حالانکہ دینی مجالس کا بنیادی کام دین سے متعلق معلومات فراہم کرنا نہیں، بلکہ بھولے ہوئے اور مانے ہوئے حقائق کو یاد دلانا ہوتا ہے جس کا انسان بڑا محتاج ہے۔ اُس وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ جب انسان کسی صدمے سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اُس وقت مذہبی اعتبار سے علم و عقل کو بروے کار نہیں لاتا۔ حالانکہ آزمایش کے پہلو سے یہی تو وہ وقت ہوتا ہے جب یہ کام کرنا چاہیے۔

اُس موقع پر زاویۂ نگاہ کے ایک خاص پہلو کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوا۔ اگر میں دینی مزاج کا حامل شخص نہ ہوتا تو اس حادثے کے باعث بہت دیر تک اعصابی تناؤ کا شکار رہتا۔ یہ ایک نقطۂ نظر ہی تھا جس نے فوراً مجھے اس تناؤ کے عذاب سے نجات دلادی۔

مادی سوچ کے غلبے کے باعث آج دنیا میں انسانوں کو ان کی مالی پوزیشن کے لحاظ سے مختلف طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اپر کلاس، مڈل کلاس، لوئر کلاس۔ جبکہ میرا خیال ہے کہ انسانوں کو مالی لحاظ سے اپر (upper) یا لوئر (lower) قرار نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے کہ مال و دولت اور اسباب و وسائل اکثر و بیشتر انسان کو ورثے یا قسمت سے ملتے ہیں۔ اس معاملے میں صلاحیت اور محنت کا دخل کم دیکھنے میں آتا ہے۔ بلکہ اگر صلاحیت اور محنت سے بھی یہ چیزیں حاصل ہوں تب بھی ان کی حقیقت میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص حیات و

کائنات کے اعلیٰ حقائق کا جتنا اچھا شعور رکھتا ہے، اور اپنے آپ کو ان کے مطابق جتنا زیادہ ڈھالتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اپر (upper) ہے۔ اس لیے کہ یہ فہم اور عمل انسان اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ اس معاملے میں پہلا قدم انسان ہی اٹھاتا ہے، اس کے بعد خدا اس کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی متقی ہی کو سب سے زیادہ عزت دار ٹھیرایا ہے، کسی کھرب پتی کو نہیں۔

میرے نزدیک اس وقت ناگی صاحب کا تعلق ''اپر کلاس'' کے ساتھ ہے۔ اگر اس صورت حال میں مجھے ''لوئر کلاس'' سے متعلق کسی آدمی سے سابقہ پیش آتا تو عین ممکن تھا کہ وہ انسانی اور زمینی واقعے کو انسان اور زمین تک ہی محدود رکھتا اور اس کا خدا اور آسمان کے ساتھ کوئی تعلق قائم نہ کرتا۔

اس واقعہ کے بعد ناگی صاحب کی میرے والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے علیک سلیک کے بعد انھیں کہا: مبارک ہو، اللہ نے اسد کو دوسری زندگی دی ہے۔ ''اپر کلاس'' کی باتیں، اپر کلاس ہی ہوتی ہیں۔ ''لوئر کلاس'' سے متعلق لوگ ایسے موقعوں پر مبارک باد نہیں دیا کرتے۔ وہ عیب دار کشتی کے عیب ہی پر نگاہ رکھتے ہیں اور شکوے، شکایتیں اور افسوس ہی کرتے ہیں۔
